حضرت مولانا

سید صدیق احمد باندویؒ

نقوش وتأثرات

مولانا محمد زکریا سنبھلی

تفصیلات

نام کتاب: حضرت مولانا سید صدیق احمد باندویؒ
نقوش وتاثرات

نام مصنف: مولانا محمد زکریا سنبھلی

صفحات:

قیمت:

پیش لفظ

حضرت مولانا سید صدیق احمد باندوی قُدّس سرہ قریبی زمانے کے اکابر اہل اللہ میں سے تھے۔ ہمارے برصغیر ہندو پاک کے دینی حلقوں میں آخری دور میں حضرت کو غیر معمولی محبوبیت حاصل ہوئی۔ مگر بہت کم لوگ ہوں گے جن کو حضرت کے غیر معمولی کمالات اور بے نظیر قسم کے حالات کا علم ہوگا۔ اخلاص، دین کے لیے مجاہدہ، سخت کوشی اور زہد جیسی ایمانی صفات میں وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ والد ماجد حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو اس وقت سے حضرت سے وابستگی اور خدمت ورفاقت کی سعادت حاصل ہوئی تھی جب حضرت کی نہ عوامی شہرت کا دور شروع ہوا تھا اور نہ بے پناہ مشغولیت ومصروفیت کا۔ ہمہ دم کام تو وہ اس وقت بھی رہتے تھے، مگر وہ حال نہیں تھا جو دیکھنے والوں نے آخری دس پندرہ سالوں میں دیکھا تھا۔ والد ماجد بیان کیا کرتے ہیں کہ اس وقت حضرت کی داڑھی میں ایک بال بھی سفید نہیں تھا۔ مگر اس وقت بھی حالات وکمالات عجیب وغریب تھے۔

ان کمالات پر مزید ان کے احسانات اور شفقتیں تھیں، جنہوں نے والد ماجد کو اسیر بنالیا۔ محبت کا یہ حال ہے کہ اُن کی زبان پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جتنا تذکرہ رہتا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا نصف بھی اپنے والدین کا نہیں رہتا۔ آٹھ سال تو لگاتار حضرت کے مدرسے میں قیام رہا، جہاں تدریس کے علاوہ حضرت کے ہر کام میں تعاون کی سعادت ملی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق تھی کہ والد ماجد مدظلہ کو ان سے شروع سے ہی نہایت قلبی عقیدت واعتماد کا تعلق ہوگیا تھا۔ خدمت تو کیا کوئی اُن کی کرتا وہ تو خود سراپا خدمت بنے رہتے تھے۔ لیکن دینی کاموں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ والد ماجد سے بے تکلف کام لیتے۔ چاہے وہ

مدرسے کے انتظامی امور ہوں چاہے تعمیر کا کام ہو، چاہے بے وقت اور مسلسل آنے والے مہمانوں کا انتظام ہو چاہے اس کے علاوہ دینی کام ہوں۔ حضرت کو بھی اُن سے ایک عجیب قسم کی محبت کا تعلق تھا، جس کو یہ عاجز بچپن سے دیکھتا آتا تھا۔ ایک مرتبہ والد ماجد نے عرض کیا میں لکھنؤ ہو آؤں؟ حضرت نے کہا میں جھانسی سے واپس آجاؤں تو جائیے گا۔ میں کہیں جاتا ہوں تو دل مدرسے میں اٹکا رہتا ہے۔ آپ ہوتے ہیں تو اطمینان رہتا ہے۔ کبھی کوئی زیادہ ہی گراں قسم کا کام ہوتا تو کہتے: ایک کام ہے یا خود کر سکتا ہوں یا آپ سے کہہ سکتا ہوں۔

ہتھورا کے آٹھ سالہ قیام کے بعد بھی کثرت سے حضرت کی خدمت میں حاضری ہوتی اور اسفار میں بھی ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا ان کے حافظے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات، ملفوظات اور عجیب وغریب قسم کے کمالات کے نمونوں کا ایک دفتر ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مؤمنانہ کردار اور کمالات کے ایسے مؤثر واقعات مجھے اس کثرت سے کہیں نہیں ملے۔ والد ماجد مدظلہ اکثر حضرت کے بارے میں اور ان کے حالات کے بارے میں ''بے نظیر'' کا لفظ بولا کرتے ہیں۔

ناظرین کے ہاتھ میں جو رسالہ ہے، یہ حضرت کے انتقال کے بعد ایک مضمون کی شکل میں الفرقان میں تین قسطوں میں چھپا۔ اس کے بعد ایک رسالے کی شکل میں یہ تینوں مضامین جمع کر دیے گئے۔ جس نے بھی اسے پڑھا عجب تأثیر محسوس کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں ایسی ہی تھیں۔ راقم سطور کے لندن میں مقیم ایک صالح دوست بھائی عثمان مالجی نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو وہاں تقسیم ہوا۔ بے شمار لوگوں نے بتایا کہ پڑھنے کے دوران بار بار ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ لکھنے والے نے بھی لکھا تھا کہ اس نے بھی مضمون بہتی آنکھوں سے لکھا ہے۔

پھر نہ جانے کتنے لوگوں کو اس رسالے سے عبرت حاصل ہوئی اور ان کے دل میں اس نمونے کی تقلید کا خیال پیدا ہوا۔ خود راقم سطور نے بار بار پڑھا اور ہمیشہ اثر بھی ہوا اور ندامت بھی۔

حضرت مولانا سید صدیق احمد باندوی نور اللہ مرقدہ ابھی ماضی قریب کی شخصیت تھے۔ ان کو دیکھنے والے ابھی بھی بے شمار ہیں۔ ایسے نمونے کی شخصیت خاص طور سے خدمت دین سے تعلق رکھنے والے اور اس کی طرف منسوب ہم جیسے لوگوں کے لیے بڑی سبق آموز ہے۔

اسی فائدہ کی نیت سے اس رسالے کو شائع کیا جا رہا ہے۔ ہم جس دور میں ہیں اس میں کردار کی بڑی کمی سب کو محسوس ہو رہی ہے۔ ہماری گفتار کی کثرت کے ساتھ ہمارے کردار میں جیسا زوال آیا ہے اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں۔ اہل اللہ کی صحبت سچے مومنانہ کردار کی تعمیر کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اس کے بعد اگر کوئی چیز اس سلسلے میں مؤثر ہے تو وہ اہل اللہ کے تذکرے اور سوانح ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ نافع رسالہ خوب عام ہو، اس لیے جو ادارہ یا جو صاحب بھی اس کو چھاپنا چاہیں ان کو مؤلف کی طرف سے اس کی اجازت ہے، بلکہ ہم ان کے ممنون ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس رسالے کے نفع کو عام فرمائے۔ اور حضرتؒ کے لیے رفع درجات کا ذریعہ اور ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

یحییٰ نعمانی

خادم المعھد العالی للدراسات الاسلامیہ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ پر جتنا لکھا جا چکا ہے قریبی زمانہ میں کم علماء پر اتنا لکھا گیا ہوگا، ان کی شخصیت واقعی تھی ہی ایسی۔ جو کچھ لکھا، لکھنے والوں نے اپنی واقفیت کی بنیاد پر لکھا۔ وہ ایک عالم دین تھے، اس رشتہ سے علماء کرام میں ان کی وقعت اور مقبولیت تھی، ایک مدرسہ کے بانی اور ناظم بھی تھے، اس رشتہ سے بھی طلبہ، اساتذہ اہل مدارس سے ان کے تعلقات تھے، وہ ایک داعی دین ہونے کی حیثیت سے بھی مشہور و معروف تھے، اس لئے دینی جلسوں اور اجتماعات میں ان کی تشریف آوری سے رونق ہو جاتی تھی، وہ دعا و تعویذ کے سلسلے میں بھی عوام و خواص کا مرجع تھے، لوگوں کو ان کے ایک ولی کامل اور خاصان خدا میں سے ہونے کا بھی یقین تھا۔ لیکن ان سے واقفیت رکھنے والے سب ہی اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان کی شخصیت کی گہرائی تک کوئی نہیں پہنچ سکا ہے۔ مجھے الحمد للہ ان سے کافی قرب نصیب ہوا، لیکن ان کی عظمت کی بلندیوں کا صحیح اندازہ مجھے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ ان کی ایک سادہ سی شخصیت میں اتنا تنوع تھا کہ اس تک رسائی بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے۔ ذیل میں اپنی یادوں کے کچھ نقوش درج کر رہا ہوں۔ اللہ ہم لوگوں کو صحیح اتباع نصیب فرمائے۔

اولین ملاقات اور پھر مولانا کے یہاں حاضری

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا تذکرہ تو طالب علمی کے ابتدائی زمانہ ہی میں کانوں میں پڑ گیا تھا میری طالب علمی کا دوسرا یا تیسرا سال تھا، جب مجھے مزید پڑھنے کے لئے اپنے وطن سنبھل سے باہر کہیں جانا تھا۔ عم محترم حضرت مولانا منظور نعمانیؒ نے دو مدرسوں کے نام تجویز فرمائے

تھے، ایک بہرائچ کا مدرسہ نور العلوم اور دوسرا حضرت مولانا سید صدیق احمدؒ کا مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہتھورا، ضلع باندہ۔ بعض ترجیحات کی بنا پر فیصلہ نور العلوم جانے کا ہوا تھا۔ مدرسہ نور العلوم میں بھی مولاناؒ کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا، ہم لوگوں کے امتحان کے سلّم العلوم اور مختصر المعانی کے پرچے مولانا نے ہی بنائے تھے اور کاپیاں بھی وہیں جانچنے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ بس اتنی ہی واقفیت مولانا اور ان کے مدرسہ کی تھی، حضرت مولانا نعمانیؒ کی زبان سے کبھی کبھی مولانا کے تقوے، للّٰہیت اور سادگی کا ذکر بھی سنا تھا، نور العلوم سے مختصر المعانی، شرح وقایہ پڑھ کر میں دار العلوم دیوبند چلا گیا۔ وہاں تین سال پڑھنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں درجہ تخصص فی الادب کے دوسالہ نصاب میں داخلہ لے لیا۔ ندوہ میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا، امتحان میں ابھی چند مہینے باقی تھے، ندوہ کی مسجد میں تبلیغی اجتماع تھا، اس میں شرکت کے لئے حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحبؒ تشریف لائے تھے۔ میں نے دیکھا مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ لوگ ایک صاحب سے ملاقات کررہے تھے، کسی نے بتایا کہ یہ باندہ کے مولانا صدیق صاحبؒ ہیں، تذکرہ پہلے ہی سن چکا تھا، حسن اعتقاد بھی عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ کے ذریعہ سنی ہوئی باتوں سے دل میں گھر کئے ہوئے تھا۔ ملاقات ہوئی اور تعارف بھی۔

پھر اسی دن تھوڑی دیر کے بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مکتبہ میں اپنے محسن اور دوست حافظ سمیع اللہ صاحبؒ سے ملاقات کے لئے گیا۔ وہ اس وقت مکتبہ کے ذمہ دار تھے۔ جیسے ہی میں نے مکتبہ میں قدم رکھا، دیکھا کہ حضرت مولانا وہاں تشریف فرما ہیں۔ میں نے سلام کیا، آپ نے جواب دیا اور فوراً ہی حافظ سمیع اللہ صاحب نے بلا کسی تمہید کے کہا: حضرت انہیں لے جایئے، غالباً مولانا کو کسی مدرس کی تلاش تھی اور اسی کا تذکرہ چل رہا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا: ارے بھئی! یہ بڑے آدمی ہیں۔ یہ ہمارے مدرسہ میں کہاں جاسکتے ہیں؟ میری زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکلا ''حضرت! آپ فرمائیں تو میں ابھی درمیان سال میں ہی تعلیم منقطع کرکے آپ کے ساتھ چلوں۔ فرمایا: تعلیم مکمل کرلیجئے، اور آئندہ سال

آ جائیے گا۔ میری قسمت کا ستارہ چمک گیا، اسے کہتے ہیں تقدیر خداوندی، آج ہی پہلی ملاقات ہوئی ہے ،اور آج ہی اللہ نے مولانا سے وابستگی کا بھی فیصلہ کرادیا۔ تعلیمی سال کے اختتام پر جب میں لکھنؤ سے سنبھل جانے لگا تو عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ نے آئندہ کے پروگرام کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے حضرت سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا ذکر کردیا، حضرت نے فرمایا: مولانا تو اپنے ہی ہیں، ان کو ہم بھی خط لکھ کر یاددہانی کرادیں گے۔ میں سنبھل چلا گیا، پندرہ بیس دن کے بعد عم محترم نور اللہ مرقدہٗ کا ایک خط سنبھل پہنچا۔ جس میں انہوں نے مولانا کے نام اپنے خط کا خلاصہ، کہ مولوی زکریا سے آپ کی اس طرح کی گفتگو ہوئی تھی، اگر آپ کے یہاں واقعی ضرورت ہو تو وہ خدمت کے لئے حاضر ہیں، لیکن ان کے لئے جگہ نکالی نہ جائے، مجھے لکھ کر بھیجا اور حضرت کا جواب بھی مجھے بھیج دیا، حضرت کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ زکریا ہمارے مدرسہ میں پڑھانے کے لئے آئیں، سرآنکھوں پر، لیکن ہمارے مدرسے میں یہ یہ نقص ہیں، مدرسہ دیہات میں ہے، شہری سہولتیں بالکل نہیں ہیں، بجلی نہیں ہے، نائی دھوبی بھی نہیں، چائے والے کی دوکان نہیں، راستہ مدرسہ تک کچا ہے، مکانات کھپریل کے ہیں، مطبخ کا نظام بہت خراب ہے، میرے گھر کے بھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں کھانے کا کچھ مناسب نظم کرسکوں، مدرسین کی تنخواہ بھی پچاس ساٹھ روپے ہے۔ عم محترم نے اس خط کو دیکھنے کے بعد مجھے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ پہلے تو میری رائے تھی، لیکن مولانا کا خط پڑھ کر اب میرا خیال یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کرو کہ تم ایسی جگہ رک سکتے ہو یا نہیں؟ ادھر میں نے بھی مولانا کے خط کا مطلب یہ سمجھا کہ مولانا معذرت ہی فرمانا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے تدریس کی زندگی شروع کرنی تھی اور میرے پاس پڑھانے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس لئے میں نے ایک سال کے لئے تو حضرت کے یہاں جانے ہی کا فیصلہ کرلیا، اور غالبًا بذریعہ خط عم مرحوم ومغفور کو بھی اس کی اطلاع دے دی، شوال کے آخر میں، میں باندہ جانے کے ارادے سے ہی سنبھل سے لکھنؤ آیا، یہاں آکر ایک امتحان اور پیش آیا، حضرت مولانا نعمانیؒ نے ایک اور مدرسہ کا بھی ذکر کیا اور

فرمایا، وہاں ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ ہوگا، لیکن رمضان میں مدرسہ کا کام بھی کرنا ہوگا۔ اُدھر مولانا کی نیکی اور تقوے کا بھی ذکر کیا، کہاں مولانا کے یہاں کے ۵۰، ۶۰ روپے اور کہاں اس مدرسہ میں ڈھائی سو روپے۔ لیکن الحمدللہ فیصلہ مولانا کے مدرسہ میں جانے ہی کا ہوگیا۔ اور غالباً شوال کی ۲۶ یا ۲۷ تاریخ کو حضرت حافظ اقبال صاحب گونڈویؒ کے ہمراہ باندہ چلا گیا۔ عم محترمؒ نے حضرت حافظ صاحبؒ کو میری رہنمائی کے لئے بھیجا تھا۔ مدرسہ جاکر اندازہ ہوا کہ حضرت نے جو کچھ اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا تھا اس میں ایک لفظ بھی خلاف واقعہ نہ تھا۔

روانگی کے وقت عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ نے کچھ نصیحتیں فرمائی تھیں جو زندگی بھر کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوئیں، حضرت نے فرمایا مولانا کے ہر کام میں ہاتھ بٹانا مگر مالیات میں دخل نہ دینا۔ آدمی ابتدا میں خیانت کی نیت نہیں کرتا ہے۔ بعض اوقات مجبوراً وانجام کار خیانت کرنی پڑتی ہے۔ الحمدللہ میں نے اس نصیحت سے بہت ہی فائدہ اٹھایا۔ دوسری بات حضرت نعمانیؒ نے یہ کہی تھی کہ مولانا اگر کتابوں کے بارے میں تم سے دریافت فرمائیں کہ تم کیا پڑھانا چاہتے ہو تو میرے حوالہ سے تم یہ عرض کردینا کہ مدرسہ کی مصلحت اور ضرورت جو بھی ہو میں اسی کے مطابق کتابیں پڑھانے کے لئے تیار ہوں، لیکن جب آپ دریافت فرماتے ہیں تو میری خواہش یہ ہے کہ ہر فن کی ابتدائی کتابیں مجھے عنایت فرمادیں۔ اور ایک کتاب اوپر کی ہدایہ یا شرح وقایہ دے دیں تاکہ نیچے سے بھی استعداد پختہ ہوتی رہے، اور اوپر کی کتابوں سے تعلق برقرار رہے۔

مدرسے سے وابستگی کے بعد:

مدرسہ حاضر ہونے کے بعد تین دن تک مولانا نے مہمان محض بنائے رکھا۔ میرے عرض کرنے پر بھی فرمادیا کہ پڑھانا تو ہے ہی، ابھی دو تین دن ذرا آرام کرلیں۔ ان تین دنوں میں مولانا نے ہمہ وقت

مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ باندہ شہر تشریف لے جانا ہوا تو بھی ساتھ لے گئے، اس پیکر شفقت ومحبت کو دیکھنے کا مجھے پہلا موقع نصیب ہوا تھا۔ جو شفقت ومحبت اس وقت ملی، الحمدللہ تا حیات باقی رہی، کبھی ایک لمحہ کو بھی انقطاع نہیں ہوا۔

تین دن کے بعد مجھے کتابیں پڑھانے کے لئے دے دی گئیں، ہر فن کی ابتدائی کتابیں اور شرح وقایہ اول ودوم میرے لئے منتخب فرمائیں، لیکن ابتدائی کتابیں بھی ایسی نہیں جو مدرسوں میں بے وقعت سمجھی جاتی ہیں، ابھی پہلے سال کے چند مہینے گذرے تھے کہ مجھے تفسیر جلالین کا کچھ حصہ بھی پڑھانے کے لئے دے دیا اور دوسرے سال تفسیر بیضاوی مجھ سے پڑھوادی اس کے بعد تو درجہ بدرجہ کتابیں اونچی ہی کرتے گئے۔

حضرت کی خوردنوازی:

میری مدرسی کا غالباً چوتھا یا پانچواں سال ہی تھا اور میرے پاس تفسیر بیضاوی، ہدایہ آخرین، تفسیر جلالین، مشکوٰۃ جلد ثانی، فصول اکبری، اور کچھ ہلکی پھلکی کتابیں بھی تھیں۔ کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں بھی میرے اوپر حضرت کی بہت ہی خاص عنایات تھیں۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے یہاں زیادہ دن نہ رک سکوں گا، اس لئے وہ اپنی سرپرستی میں مجھ سے سبھی کچھ پڑھوالینا چاہتے تھے۔ میں نے تو ان کی خدمت ہی میں جاکر تدریس کی ابتدا کی تھی، اس لئے بسا اوقات مجھے ان کی سرپرستی کی ضرورت پڑتی تھی، اور میں بلاتکلف ان سے پوچھتا اور رہنمائی حاصل کرتا تھا۔ میں جب بھی کسی کتاب کی عبارت حل کرنے جاتا تو حضرت بتادیتے اور میرے جانے کے بعد وہاں موجود طلباء سے کہتے کہ اس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اس خیال سے کہ طلبا میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم نہ کرلیں بعد میں بھی حضرت مجھے یاد فرماتے اور کسی بھی کتاب کی عبارت کا مطلب طلبہ کی موجودگی

میں مجھ سے پوچھتے، کبھی میں کچھ عرض کر دیتا تو غیر معمولی مسرت کا اظہار فرماتے۔ اور کبھی میں بتلانے سے قاصر ہوتا تو خود مطلب بیان فرماتے اور مجھ سے توثیق کراتے۔ اور یہ بھی فرماتے یہ مطلب آپ کی برکت سے سمجھ میں آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب میری عزت افزائی اور طلبہ کے ذہنوں کو میری طرف سے صاف رکھنے اور کسی غلط تاثر کے قائم نہ ہونے دینے کے لئے تھا۔ میں نے کسی ذمہ دار مدرسہ کے ایسے حالات نہ دیکھے نہ سنے تھے، حضرت کی عزت افزائی کا ایک واقعہ انہیں کے الفاظ میں اور لکھتا ہوں۔ ویسے ایاز اپنی حقیقت سے واقف ہے، کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔

میں حضرت کے کمرے کے سامنے برآمدہ میں شرح وقایہ پڑھا رہا تھا، کہ اچانک حضرت تیزی کے ساتھ کمرہ سے باہر تشریف لائے۔ اور سب طلبہ کے سامنے میرے پڑھانے کی تعریف فرمانے لگے۔ اور فرمایا: میں سوچ رہا تھا کہ اس مشکل جگہ کو آپ کیسے حل کریں گے۔ واللہ کیا تعبیر آپ نے کی ہے۔ مولانا اسے قلمبند کر دیجئے، مولانا میرے کام آئے گا۔ مولانا اسے قلمبند کر دیجئے، مولانا میرے کام آئے گا''۔ اور یہ جملہ بار بار دہراتے رہے، میں اب بھی جب یہ باتیں لکھ رہا ہوں آنکھوں میں آنسو ہیں، اس مرد خدا کے احسانات کا نہ بدلہ ادا کر سکا ہوں نہ کر سکوں گا، ہاں الحمدللہ محبت اور عقیدت ہمیشہ رہی اور دعا کی توفیق بھی ملتی رہی، خدا کرے ہمیشہ یہ توفیق باقی رہے، مجھ حقیر کے ساتھ ان کے لطف وکرم کے ایسے واقعات بہت ہیں، اپنے اساتذہ کے بعد پڑھنے پڑھانے کی زندگی کی تعمیر میں حضرت کے اس طرح کے احسانات کا بڑا دخل رہا ہے۔ حضرت کے لطف وکرم سب ہی اساتذہ کے ساتھ یکساں تھے، لیکن اخفا کا یہ حال تھا کہ کسی کو دوسرے کے ساتھ ہونے والے احسانات کا علم کم ہی ہوتا تھا، اس لئے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضرت مجھ سے سب سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔ مدرسہ کے اساتذہ سب ہی ہر اعتبار سے مولانا سے بہت چھوٹے تھے، لیکن مولانا سب کو اپنا محترم اور مخدوم بنا کر رکھتے تھے۔ اگر کبھی کسی استاذ نے تنخواہ لینے کے لئے حضرت کے پاس جانے میں تاخیر کر دی تو حضرت اس کی

قیام گاہ پر لاکر تنخواہ عنایت فرماتے تھے۔

باندہ تشریف لے جاتے تو اساتذہ سے دریافت فرماتے، میں باندہ جارہا ہوں کوئی کام تو نہیں ہے؟ اور یہ سوال اتنا مبنی برحقیقت ہوتا تھا کہ بعض اساتذہ بتا بھی دیتے تھے کہ یہ کام ہے، اور حضرت وہ کام کرتے بھی تھے۔ میرے ساتھ تو یہ بھی لطف وکرم بار بار ہوا کہ باندہ سے کوئی چیز لائے اور کمرہ پر آکر بہت آہستہ سے آواز دی اور فرمایا میں باندہ گیا تھا، یہ چیز آپ کے لئے لے آیا ہوں۔ ان چیزوں میں کبھی موسم کا کوئی پھل ہوتا، کبھی مٹھائی ہوتی، یہ معاملہ جیسا کہ ابھی عرض کیا اور اساتذہ کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا، مگر مجھے تو اپنے ساتھ ہونے والے لطف وکرم کا علم ہوتا تھا۔

مولانا کا بچپن کیسے گذرا

مولانا کی زندگی ازاول تا آخر مجاہدانہ زندگی ہے۔ پوری زندگی میں آرام وراحت اور سکون واطمینان کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔ حضرت اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ گاؤں میں اتنی غربت تھی کہ عام طور پر بچوں کو صبح ہی بکریوں کی طرح جنگل کو نکال دیا جاتا تھا، بچے صبح سے شام تک جنگل میں رہتے، جس زمانہ میں گولر یا اس جیسی چیزیں ملتیں ان سے پیٹ بھر لیتے، جنگلی بیروں کے زمانہ میں دن بھر وہی کھاتے پھرتے، جب چنے کا ساگ کھانے قابل ہوتا تو وہی پیٹ بھرنے کا ذریعہ ہوتا، اور شام کو گھر چلے آتے، دوسرے دن دن بھر بھی یہی ہوتا۔ اس کے بعد فرماتے تھے کہ چونکہ میں حفظ کرتا تھا اس لئے مجھے روٹی ملتی تھی، میری دو چھوٹی چھوٹی بہنیں تھیں ان کو بھی عام بچوں کے ساتھ صبح گاؤں سے باہر بھیج دیا جاتا۔ میں اس پر روتا تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنی روٹی میں ان کو شریک کرلوں گا، لیکن میری ایک نہ چلتی تھی، یہ واقعہ جب بھی حضرت نے سنایا ہمیشہ آبدیدہ ہوجاتے اور آواز گلے میں پھنس جاتی تھی۔ یہ دونوں بہنیں کم عمری ہی میں انتقال کرگئی تھیں۔

مولانا کی ابتدائی طالب علمی

اپنی ابتدائی طالب علمی کا یہ واقعہ حضرت نے بار بار سنایا کہ میرے استاد جو گاؤں کی مسجد میں مجھے حفظ کراتے تھے صرف ۷ یا ۸ پارے کے حافظ تھے۔ جب میں نے اتنے پارے حفظ کر لئے تو فرمایا، بیٹا اب تم کہیں باہر چلے جاؤ، ہم تو صرف اتنا ہی پڑھا سکتے تھے۔ حضرت کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، والدہ مرحومہ نے کچھ کر کرا کے تھوڑا بہت انتظام کانپور جانے کا کر دیا۔ حضرت کے ساتھ کچھ خشک روٹیاں اور غالباً تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے بھی ساتھ کر دئے۔ کانپور کے کسی مدرسہ میں جا کر داخلہ لے لیا۔ مدرسہ سے کھانے کا انتظام ہوا نہیں یا حضرت نے لینا پسند نہیں کیا۔ یہ تفصیل مجھے یاد نہیں رہی۔ بہر حال کھانا مدرسہ سے نہیں ملتا تھا، کچھ دن تو ساتھ لائے ہوئے سامان پر گزارا کیا، جب وہ ختم ہو گیا تو اللہ نے ایک وقت کے کھانے کا انتظام اس طرح کرا دیا کہ کانپور کے استاد صاحب نے فرمایا صدیق! تم ہمارے گھر سرکاری نل سے پانی بھر دیا کرو اور ایک وقت کا کھانا ہمارے گھر سے لے لیا کرو۔ ان کا گھر بالائی منزل پر تھا دو دو بالٹی لے کر زینہ پر چڑھنا پڑتا تھا۔ حضرت فرماتے تھے: بیچ زینہ میں کھڑے ہو کر رو لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا ملتا تھا۔

لیکن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب بننے کے لئے ابھی اور سخت تربیت اللہ کو منظور تھی، حضرت نے بار بار سنایا کہ ایک مہینہ بھی اس ایک وقت کے کھانے کے انتظام کو نہ ہوا تھا کہ ہمارے گاؤں کے ایک ساتھی حافظ نعمت اللہ میرے ساتھ پڑھنے کے لئے کانپور آ گئے، اب صورت یہ تھی کہ ایک وقت کا کھانا اور دو آدمی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک ساتھی اور آ گئے اور اب ۲۴ ر گھنٹے میں صرف ایک ایک چپاتی ہی حصہ میں آتی تھی۔ یہ نئے آنے والے ساتھی تو اس آزمائش کو برداشت نہیں کر سکے اور جلد ہی وطن واپس چلے گئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ نعمت اللہ دونوں نے ایک سال پورا صرف ایک وقت

کی ایک خوراک میں گذرادیا۔

مدرسہ کے قیام کا محرک

ضلع باندہ اوراس کے قرب وجوار میں کوئی قابل ذکر دینی ادارہ نہ تھا،اورنہ کوئی شخصیت مدت سے دینی کام کرنے والی رہی تھی،اس لئے اس علاقہ کا دینی حال بہت ہی خراب تھا،مسلمانوں کی ایک بڑی تعدادایسی تھی جوصرف نام کے مسلمان تھے حقیقت اسلام سے دورکا واسطہ بھی نہ تھا، بلکہ بعض برادریاں تو اپنا تعارف اس طرح کراتی تھیں کہ ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان ہم تو فلاں برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد باندہ ضلع میں شدھی تحریک والوں نے ایسے کمزورمسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کردیا تھا اورارتداد کا ایک سیلاب سا آگیا تھا،سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسلمان یاتو واقعی مرتد ہوگئے تھے یابالکل ارتداد کے قریب پہنچ گئے تھے۔حضرت اس زمانہ میں فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ میں پڑھاتے تھے۔وہاں باندہ اوراس کے اطراف کی یہ خبریں پہنچتی رہتی تھیں،خودسناتے تھے کہ اچانک ایک رات کو جب سونے کے ارادے سے لیٹا یہ خیال آگیا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہیں فرمائیں گے کہ تم نے یہ کتابیں پڑھائی تھیں کہ نہیں؟ بلکہ مجھ سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارے علاقے میں ارتدادپھیل رہا تھا،لوگ مرتد ہورہے تھے تم نے کیا کیا؟ اس سوال کے ذہن میں آنے سے نیند غائب ہوگئی۔ساری رات اسی فکر میں ذہن غلطاں وپیچاں رہااورایک منٹ کو بھی نہ سوسکا۔لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی دل ودماغ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب اپنے علاقہ کے لوگوں میں کام کرنا ہےاوران کے ایمان کی فکر کرنی ہے۔پھراسی ارادہ سے اہل مدرسہ سے اجازت لے کراپنے یہاں چلا آیا۔شروع میں کام کی صورت یہ تھی کہ ایسے علاقوں کے دیہات میں جہاں ارتداد کی وبا عام ہورہی تھی حضرت نے تن تنہا دورہ شروع کردیا،اور جہاں اور جیسے دین کی بات کرنے کا موقع ملتابات کرتے۔

میں نے وفات سے کچھ دن پہلے اس دورہ کی کچھ تفصیلات دریافت کی تھیں، تو فرمایا کہ جو لوگ میرے گاؤں ہتھورا سے واقف تھے وہاں جا کر تو ہتھورا کے حوالے سے تعارف کرا کر بات کرتا، اور جو لوگ میری سسرال کے لوگوں سے واقف تھے ان سے ان لوگوں کے حوالے سے بات شروع کرتا۔ اسی طرح ایک دن میں کئی کئی دیہات گھوم پھر کر دین کی بات ان لوگوں تک پہنچایا کرتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ رات کا قیام کبھی کسی کھلیان میں کبھی کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح کام کرتے ہوئے کئی مہینے گذر گئے تو محسوس ہوا کہ مدرسہ کی ضرورت ہے جسے اس کام کے مرکز کے طور پر استعمال کیا جائے، اور ان لوگوں کے بچوں کو وہاں پڑھانے کے لئے لے جایا جائے۔ مدرسہ کی تجویز مولانا نے باندہ اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کے پاس جا کر رکھی۔ بعض حضرات سے بڑی امیدیں وابستہ کر کے ان کے پاس گئے۔ لیکن اس کام کے نام سے ہی سب کانوں پر انگلیاں رکھ لیتے تھے۔ لوگوں نے یہ تک کہا صدیق! یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے اور تم مدرسہ کی بات کرتے ہو؟ اس سلسلہ کی تفصیلات حضرت بہت بتایا کرتے تھے۔ بہت سی باتیں ابھی تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں مگر بات بہت طویل ہو جائے گی۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر مولانا نے اپنے گاؤں میں مدرسہ کھول ہی دیا۔ گاؤں والے سب بے حد غریب، کچے کچے مکانات، مسجد بھی بہت چھوٹی اور خستہ۔ مگر مولانا کے عزم مصمم کے سامنے کوئی رکاوٹ رکاوٹ نہ رہی۔ ان ہی دنوں حضرت نے ایک طویل نظم کہی تھی۔ جس کے کچھ اشعار حضرت نے مجھے کئی بار سنائے۔ اور جب بھی سناتے آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ خدا کرے وہ نظم کہیں محفوظ ہو۔ نظم کیا تھی ٹوٹے اور دکھی دل کی آہیں تھیں۔

مدرسہ کی تعمیر کے متعلق کچھ باتیں

حضرت کا مدرسہ اب تو ایک عظیم الشان قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ میں جب حاضر ہوا تھا اس وقت بھی کافی عمارتیں بن چکی تھیں۔لیکن موجودہ عمارتوں کا شاید دسواں حصہ ہی تھیں۔اس وقت سے بھی کئی سال پہلے یعنی اب سے تقریباً ۳۵ سال پہلے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے مدرسہ دیکھ کر تحریر فرمایا تھا: اللہ اکبر! گاؤں کتنا چھوٹا اور مدرسہ کتنا بڑا!!! اللہ کے دین کے قلعے کہاں کہاں اللہ کے بندوں نے تعمیر کر دیئے ہیں۔ بالکل جنگل میں منگل ہوتا ہے‘‘۔لیکن یہ عمارتیں کیسے بنی ہیں؟ موجودہ دور میں اس کا تصور بھی مشکل ہے۔میں نے سنا بھی اور دیکھا بھی کہ تعمیر مدرسہ کے لئے خود چھوٹا سا بھٹہ لگایا جاتا تھا۔اس میں ہر ہر مرحلہ پر خود حضرت اور اساتذہ وطلبہ کام کرتے تھے۔پھر تعمیر کے کام میں حضرت کے ساتھ اساتذہ وطلبہ بالکل مزدوروں کی طرح لگ جاتے تھے۔مورنگ اور سمینٹ کے مسالے سے ہاتھوں میں زخم ہو ہو جاتے تھے۔ یہ جو قلعہ نما عمارت بنی ہے اس میں بلا مبالغہ حضرت اور حضرت کے مدرسہ کے کتنے ہی اساتذہ وطلبہ کا پسینہ ہی نہیں خون بھی شامل ہے۔ اللہ ان نعمتوں اور کاوشوں کا اپنی شان عالی کے مطابق سب ہی کو اجر عطا فرمائے۔

مدرسہ کے قریب ایک نالہ ہے، برسات میں اس کا پانی اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنکر بڑی مقدار میں بہالاتا ہے، وہ کنکر خاص خاص جگہوں پر نالے کے کنارے جمع ہو جاتے ہیں، پتھر کی تعمیر میں چونے کے ساتھ ملا کر یہ کنکر استعمال کئے جاتے ہیں، حضرت اس بات سے واقف تھے کہ نالے کے کس کس موڑ پر کنکر زیادہ ملتے ہیں، پھر ان کو جمع کرنا اور دھونا بھی خوب جانتے تھے،طلبہ کو لے کر خود نالے پر تشریف لے جاتے،طلبہ کے ساتھ کنکر جمع کرتے،ان کو ٹوکریوں میں کر کے خود دھوتے اور بیل گاڑی پر لدوا کر لاتے تھے۔حضرت کے ساتھ کام کرنے میں بڑا ہی مزہ آتا تھا،سبھی لوگ حضرت سے بڑے بے

تکلف تھے، بلکہ بعض طلبہ تو جو پرانے ہو چکے تھے حضرت سے چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتے تھے، ایسا پیار اور محبوب مربی نہ دیکھا نہ سنا، لطیفے بھی ہوتے تھے، حضرت ہنستے ہنساتے بھی تھے، ایسی حسین ہنسی اور اتنے خوبصورت دانت کم ہی دیکھے ہوں گے۔ تعمیر کے سلسلہ میں سب لوگوں سے مشورے بھی لئے جاتے اور مشوروں کو قبول بھی فرماتے تھے، اس طرح تنکا تنکا کر کے یہ آشیانہ تعمیر ہوا ہے۔

اپنے مدرسہ کے علاوہ حضرت کو بستی بستی - قریہ قریہ مکاتب کے قیام کی بہت فکر رہتی تھی، ایسے مدرسے یا مکاتب جن کا پورا خرچ حضرت ہی کے ذمہ تھا، تقریباً سو تھے۔ اللہ جانے کتنے ہی دیہات ہیں جہاں مسلمانوں کی اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسجد نہ بن سکی تھی، حضرت نے وہاں کے ہندو بھائیوں کو اعتماد میں لے کر مسجدیں بنوا دیں، جہاں مسجد کی گنجائش نظر نہ آئی وہاں قبلہ رخ ایک کمرہ درسگاہ کے نام پر بنوا دیا۔ اور اسی میں تعلیم اور نماز کا نظم فرما دیا کرتے تھے۔ حضرت کہا کرتے تھے کہ جس گاؤں میں مسجد ہے اور جس گاؤں میں مسجد نہیں ہے ان دونوں گانووں کے مسلمانوں میں دینی اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

تواضع وانکساری

مولانا تواضع وانکساری کے پیکر تھے، اپنی ذات کو سب سے کمتر اور اپنے کو سب کا ادنیٰ خادم سمجھتے تھے۔ خدمت کے واقعات بہت سے پڑھے ہوں گے، یہ بھی پڑھ لیجئے:

مدرسہ میں مسجد کے سامنے بارہ عدد بیت الخلا بنے ہوئے تھے، جو طلبہ واساتذہ سبھی کے استعمال میں رہتے تھے، باندہ کے دیہاتی طلبہ جس جس طرح ان کو گندا کر سکتے تھے، کرتے تھے، لیکن صبح کے وقت سب بیت الخلا روزانہ بالکل دھلے ہوئے ہوتے تھے، کسی کو دھونے والے کا پتہ نہ چلتا تھا، ایک رات تقریباً ڈھائی بجے مجھے بیت الخلا جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، جب میں کسی قدر قریب پہنچا تو دیکھا

کہ کوئی صاحب مسجد کے وضوخانے کا پانی جس گڑھے میں جمع ہوتا تھا اس سے بالٹی میں لے کر بیت الخلا دھورہے ہیں، غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے حضرت ہی ہیں، کہاں کا تقاضا؟ خاموشی سے واپس آکر اپنی چار پائی پر لیٹ گیا، اور حضرت کو یہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا، آگے بڑھ کر حضرت کے ساتھ شریک ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ حضرت کو راز کے فاش ہوجانے پر افسوس ہوگا، حضرت کو یہ سب کرتا دیکھ کر نیند کا کیا سوال؟ اس کام سے فارغ ہوکر مسجد کے قریب کنویں پر جونل لگا تھا وہاں جا کر غسل فرمایا۔ اور مسجد کے صحن میں تہجد کی نماز شروع کردی۔ اللہ ہی جان سکتا ہے کہ اس کے یہاں ان کاموں کا کیا اجر ملے گا اور اس تہجد کی نماز پر اس کو کتنا پیار آتا ہوگا۔ اپنے کمرے کے سامنے صحن اور برآمدہ میں جھاڑو دے لینا تو کوئی بات ہی نہ تھی یہ تو روزمرہ کا کام تھا۔

بہت ہی معزز مہمانوں کے لئے حضرت کے کمرے کے قریب دو بیت الخلا بنے ہوئے تھے۔ ایک بار مدرسہ میں ایک بہت محترم بزرگ آنے والے تھے کہ اس بیت الخلا کا ٹینک بھر گیا۔ مولوی محمد منظور اور مولوی انیس احمد کو جو حضرت کے قریبی لوگوں میں ہیں، بلایا اور فرمایا ایک کام ہے، ہم ہی لوگ کرسکتے ہیں، بتلاؤ کروگے؟ ان لوگوں نے عرض کیا ضرور، فرمایا یہ کام ہے۔ ان نوجوانوں کو بھی شاباش ہے کہ ان لوگوں نے حضرت کے ساتھ یہ کام کیا، انہی دونوں کی روایت ہے، حضرت بھی بالٹیاں بھر بھر کر غلاظت وہاں سے لے جا کر دور کھیت میں ڈال کر آتے تھے۔

طلبہ کے ساتھ حسن سلوک

طلبہ کے ساتھ اپنی اولاد کا سا معاملہ کرتے، ان کی ہر طرح کی فکر فرماتے، طلبہ کو کھانا تو مدرسہ سے ملتا ہی ہے، کسی غریب طالب علم کے پاس پڑے نہ ہوتے تو اس کی فکر بھی فرماتے، دوا علاج کا بھی حتی الامکان اہتمام فرماتے تھے، مدرسہ کے ایک طالب علم کے چیچک نکل آئی تھی، حضرت سفر میں تھے، تین

چار دن کے بعد سفر سے آئے، آتے ہی مدرسہ اور اہل مدرسہ کی خیریت دریافت کی، جب اس طالب علم کی چیچک کا علم ہوا تو بہت بیچین ہو گئے اور فوراً باندہ واپس جانے کا ارادہ فرمایا، ہم لوگوں نے ہر چند عرض کیا کہ آپ ابھی طویل سفر سے تشریف لائے ہیں، سخت گرمی کا وقت ہے کسی کو بھی اپنا خط لیکر باندہ کے کسی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیجئے، لیکن کسی بھی طرح ہم لوگوں کی درخواست قبول نہیں فرمائی۔ اور سخت دھوپ میں اسی وقت باندہ تشریف لے گئے۔

اس وقت باندہ جانے کے لئے دو کلو میٹر پیدل چل کر بس سے جانا پڑتا تھا، بسوں کا نظام بھی اچھا نہ تھا، خصوصاً دو پہر میں تو بعض اوقات کافی دیر انتظار کرنے پر بس ملتی تھی، اتنی دیر لو کے تھپیڑوں سے ہی واسطہ پڑتا تھا، حضرت مدرسہ سے تقریباً ۱۲ بجے روانہ ہوئے تھے، اور تین بجے باندہ کے کئی ڈاکٹروں کو لے کر جو سب ہی حضرت سے نیاز مندی کا تعلق رکھتے تھے، تشریف لائے۔ ڈاکٹر نے اس طالب علم کو دیکھا اور حضرت کو اطمینان دلا دیا۔ جب تک وہ طالب علم بالکل صحت یاب نہ ہو گئے تب تک حضرت ان کی تیماری داری اور دوا علاج کی فکر خود فرماتے رہے، ایک بار ایک پرانے شاگرد کی کسی بات پر ذکر فرمانے لگے اس شخص کا میں نے پیشاب پاخانہ دھویا ہے، اور فرمایا یہ حقیقت ہے مبالغہ نہیں۔

ضلع باندہ اور اس کے قرب وجوار کے دیہات میں مسئلہ صرف علم اور دینداری کے نہ ہونے کا نہیں تھا، بلکہ اسلام کی بقا اور عدم بقا کا تھا۔ اور مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ اتنا ہی اہم تھا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے ان دیہات کے طلبہ کی بہت رعایت کرتے تھے۔ یہ طلبہ اگر مدرسہ میں پڑے رہیں، خود پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں تب بھی مولانا کو ان کا قیام منظور تھا۔ میں اپنی کوتاہ نظری سے کبھی کبھی ایسے نہ پڑھنے والے طلبہ کے بارے میں حضرت سے کچھ نامناسب گفتگو کر لیا کرتا تھا، ایک طالب علم لال محمد تھا بالکل پڑھتا نہ تھا، کئی بار حضرت سے عرض کیا کہ اس کو اس کے گھر بھیج دیجئے، حضرت ٹال دیتے، ایک دن فرمانے لگے: لوگ کہتے تھے لال محمد نہیں پڑھ پائے گا، دیکھئے اس کا قرآن مجید

ناظرہ ختم ہوگیا، میں سمجھ گیا مخاطب میں ہی ہوں، میں نے عرض کیا: اس نے پانچ سال میں صرف ناظرہ قرآن ختم کیا، حضرت کا جملہ ہمیشہ یاد رہے گا، کسی قدر شانِ جلالی کے ساتھ فرمایا: مولانا اپنے گاؤں میں اسلام کو سمجھنے والا صرف لال محمد ہوگا، اس علاقہ کے لڑکے یہاں پڑے رہیں، خواہ ایک لفظ نہ پڑھیں، تب بھی مجھے گوارہ ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں، بالکل ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا، اس جملہ سے وہ سامنے سے ہٹ گیا۔ مجھے اس وقت کی اپنی وہ کیفیت بھی ابھی تک خوب یاد ہے، بہت دیر تک اپنی کوتاہ بینی اور حضرت کی نگاہ کی دوربینی کو سوچتا رہا کہ اللہ کے اس بندہ کی نگاہ ہر وقت کہاں کہاں رہتی ہے، ہم لوگ تو غور وفکر کے بعد بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

مہمانوں کا اکرام

احادیث میں اکرام ضیف کو ایمان کی علامت بتایا گیا ہے، حضرت کے یہاں اس کا اہتمام آخری حد تک تھا، مہمانوں کی آمد تو وقت بے وقت ہوتی ہی رہتی تھی، مولانا مہمانوں کو مدرسہ کے ذمہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ اب اس کی صورت یہی تھی کہ اپنے گھر جو کچھ ہو یا ہو سکے لے آئیں، اور بعض بہت ہی قریبی عزیزوں کے گھروں سے کچھ لے آئیں۔ مولانا کا کمرہ جو دارالضیافہ بھی تھا، اس میں ایک عدد المونیم کی سینی، چار المونیم کے پیالے اور ایک کپڑا جس میں مختلف رنگوں کے پیوند لگے ہوئے تھے رکھا رہتا تھا۔ اگر بے وقت مہمان آئے تو حضرت خود یہ مذکورہ سامان اٹھاتے اور چل دیتے اپنے گھر اور عزیزوں کے گھروں سے کھانا لانے کے لئے۔ جس جس کا گھر راستہ میں پڑتا جاتا آواز دیتے جاتے اور ایک پیالہ پکڑاتے جاتے۔ صاحب خانہ اپنے گھر سے جو کچھ بھی ہوسکتا تھا مدرسہ لے کر پہنچ جاتے۔ پھر حضرت اپنے گھر جا کر جو کچھ ملتا یا انتظام ہوسکتا لے آتے۔

میں الحمدللہ مولانا کے کسی حد تک قریب تھا، کبھی کبھی یہ کام میں نے بھی کیا ہے، مگر بہت کم۔ گاؤں

کے لوگوں کا میرے ساتھ بھی بہت محبت کا تعلق تھا، ایک دفعہ حضرت کی عدم موجودگی میں بے وقت مہمان آگئے۔ ایک بہت ہی قریبی دوست کے گھر جا کر میں نے بھی آواز لگادی، وہ گھر پر نہ تھے، بچوں کے ذریعہ اپنی بات اندر تک پہنچادی کہ مہمان آگئے ہیں، ایک پیالہ سالن یا دال دے دیں۔ اللہ ان کی اہلیہ کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بچے کے ذریعہ پوری پتیلی باہر بھیج دی، کہ مہمانوں کو کھانا کھلا دیں، جو بچ جائے واپس کر دیں، ابھی بچوں نے کھانا نہیں کھایا ہے، اس گاؤں کے لوگ مہمان نوازی میں بے مثال تھے، حضرت گاؤں کے لوگوں کے احسانات کا، جو مدرسہ کے ابتدائی زمانہ میں ان لوگوں نے کئے تھے، بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ میں حضرت کی اس سنت پر کبھی کبھی عمل کر لیا کرتا تھا، لیکن حضرت کو یہ بات برداشت نہ تھی کہ میں کسی کے دروازے پر جا کر اس طرح آواز لگاؤں، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت کی کچھ طبیعت خراب تھی، گھر تشریف لے گئے تھے کہ بے وقت مہمان آگئے، میں نے یہ سوچا کہ حضرت کو زحمت ہوگی، خود ہی کچھ انتظام کر لیا جائے، وہی سینی اور کٹورے لے کر چل دیا، کسی ذریعہ سے مہمانوں کا حضرت کو علم ہو گیا، فوراً چلے آئے، ادھر میں مدرسہ سے نکل چکا تھا، راستہ میں ہی ملاقات ہوگئی۔ حضرت کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، اور فرمایا: مولانا! سب کام آپ سے کرا لیتا ہوں، یہ کام آپ سے نہیں کراؤں گا، پھر بڑے درد سے فرمایا: یہ تو میرے نصیب ہی میں لکھا ہے۔

اصلاح بین الناس کی فکر

اللہ کے بندوں میں باہمی محبت والفت اور اچھے تعلقات کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کے بالمقابل آپس کی لڑائی اور باہمی نزاع کو شریعت میں بہت ناپسند سمجھا گیا ہے۔ حضرت کو اصلاح بین الناس کی بڑی فکر رہتی تھی۔ خصوصاً وہ لوگ جو دیندار کہے جاتے ہیں، یا کسی دینی جماعت یا ادارہ سے

وابستہ ہیں، جن کا اختلاف صرف دو شخصیتوں یا دو گروہوں کا اختلاف نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے نتائج بڑے دوررس اور دین کے لئے بڑے مضر ہو سکتے ہیں، ایسے لوگوں کے اختلافات دور کرنے کے لئے حضرت بڑی کوششیں فرماتے اور جو کچھ بن پڑتا اس سے گریز نہ کرتے۔ ایک مدرسہ کے دو استادوں میں کچھ اختلاف ہو گیا اور بات کچھ حد سے متجاوز ہو گئی۔ حضرت نے ان دونوں کے درمیان صلح کرانی چاہی، ان میں سے ایک تو راضی ہو گئے، لیکن دوسرے جن پر کچھ زیادتی ہو گئی تھی کسی طرح راضی ہونے اور دوسرے کے معافی مانگنے پر بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے، حضرت نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی۔ میں اور ایک صاحب اور ہاں موجود تھے۔ جب کسی طرح راضی نہ ہوئے تو حضرت نے اپنی ٹوپی اتاری اور ان کے قدموں پر ڈال دی، ہم لوگوں پر تو جیسے بجلی گر گئی، اور مجلس میں ایک سکتہ سا سب کو ہو گیا، لیکن حضرت کے اس عمل نے اپنا کام کر دیا اور آخر ان کا دل بھی نرم پڑ گئے اور انہوں نے بھی حضرت کے ارشاد کے مطابق مصالحت کر لی۔

اسی طرح کا واقعہ لکھنؤ کے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح وصفائی کرانے کے سلسلے میں بھی پیش آیا، اور جب کچھ پر جوش نوجوانوں کو مصالحت کے لئے حضرت کسی طرح تیار نہ کر سکے، تو آخر میں روتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار کر ان کی قدموں میں ڈال دی، اور نتیجہ یہاں بھی اچھا ہی رہا، اور الحمدللہ ایک خطرناک قسم کا خون خرابہ ٹل گیا، اس قسم کے واقعات حضرت کی زندگی میں بار بار پیش آئے ہیں، اور ان کی کوششوں نے کتنے ہی مسلمان خاندانوں اور دینی اداروں کو ہلاکت وبربادی سے بچالیا۔ میری نگاہوں نے ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کا مصداق حضرت سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔

آخری سفر جو سفرِ آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا، اس سے چند دن پہلے بھی حضرت اس حال میں کہ ٹانگ کے درد کی وجہ سے قدم زمین پر رکھنا مشکل تھا، ایک مدرسہ میں پیدا شدہ باہمی نزاع کو دور کرنے کے لئے باندا سے سیکڑوں میل کا سفر کر کے ایک جگہ تشریف لے گئے تھے۔ اور واپسی میں لکھنؤ تشریف

لائے تھے، میرے عرض کرنے پر کہ اس حال میں بھی آپ سفر سے باز نہیں آرہے ہیں، فرمایا: کہ بہت مجبوری میں یہ سفر کیا ہے اور بہت ضرورت اس کی تھی، پھر یہ مذکورہ بالا بات بتلائی، اور فرمایا الحمدللہ سفر مفید رہا، اہل مدرسہ اختلافات ختم کرنے پر راضی ہو گئے۔

ایثار و قربانی کے چند نمونے

حضرت مولانا کے گھر میں کھانے کا حال بہت ہی سادہ تھا، عام طور پر سب ہی لوگ چٹنی روٹی یا چٹنی چاول ہی کھاتے، یا اسی درجہ کا کوئی اور کھانا دلیہ یا مہیر پک جایا کرتا تھا مہیر بندیل کھنڈ کا ایک خاص دیہاتی کھانا ہے، چاول کو چھاچھ یعنی مٹھّے میں پکالیا جاتا ہے، گاؤں میں بہت ہی کم گھر ایسے تھے جن میں دونوں وقت دال روٹی چلتی ہو، حضرت کے لئے بھی گھر سے موٹی موٹی دو روٹی اور ان پر خشک چٹنی رکھی ہوئی چلی آتی تھی۔ اللہ جنت میں جنت کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں کھلائے، اس بندۂ خدا کو چٹنی پسند بھی بہت تھی۔

میں جب شروع میں حاضر ہوا تو چند دن دونوں وقت حضرت کے ساتھ کھانا کھاتا رہا، بعد میں پتہ چلا کہ یہ دال اور سبزی کا تو میرے لئے اہتمام ہوتا ہے، مجھے تو حضرت رومال میں سے گیہوں کی چپاتی نکال کر دیتے، اور خود اسی رومال میں سے لقمہ توڑ کر ہی نکال کر کھاتے تھے، کئی وقت کے بعد یہ بھی پتہ چلا کہ یہ صورت اس لئے اختیار فرمائی جارہی ہے کہ حضرت جوار کی روٹی کھا رہے ہیں اور گیہوں کی چپاتی کا اہتمام بھی صرف اس احقر کے لئے ہے، کھانے کا یہ ساتھ حضرت کے غیر معمولی مشاغل کی وجہ سے زیادہ دن نہ رہ سکا۔ ان کا نہ کوئی وقت متعین، نہ کھانا کھانا ہی طے تھا، اس وقت بھی مشاغل کا یہ حال تھا کہ دوپہر کا کھانا شام تک رکھا رہتا اور کھانے کی نوبت نہ آتی، اور شام کو یونہی واپس چلا جاتا، بعد میں تو کھانا بس ایک ہی وقت کھاتے تھے، ناشتہ بھی غائب اور شام کا کھانا بھی بند۔

میں اس خانوادہ کی کیا کیا بات یاد کروں، ہر ہر بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ جب میں نے الگ کھانا شروع کر دیا تو مطبخ سے بہت ہی سادہ سی دال روٹی آجایا کرتی تھی، اور اکثر ہی بلکہ تقریباً روز ہی حضرت کے گھر سے، ایک پیالے میں یا چھوٹی سی المونیم کی پتیلی میں، کبھی سبزی کبھی دال آجاتی تھی، اس وقت تک مجھے حضرت کے گھر کا حال معلوم نہ تھا۔ ہتھورا آئے ہوئے شاید چند مہینے ہی گذرے تھے، ایک دن میں کھانا کھانے کے لئے اپنے کمرہ میں بیٹھ چکا تھا کہ مولانا کی ایک بچی جس کی عمر اس وقت تقریباً چھ سات سال ہوگی، میرے لئے سبزی لے کر آئی، میں نے اس سے کہا کہ تم کھانا کھالو، اس نے کہا میں کھانا کھا چکی ہوں۔ میں نے بس یونہی مزید سوال کر لیا کہ کیا کیا کھایا؟ اس نے کہا کہ چٹنی چاول۔ میں نے کہا کہ یہ سبزی کیوں نہیں کھائی؟ بے چاری بھولی بھالی بچی، اس نے گھر کی حقیقت صاف صاف بیان کر دی کہ یہ تو صرف آپ کے لئے پکتی ہے، یہ سننا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم یہ واپس لے جاؤ، اس نے کچھ تکلف کیا، لیکن میرے اصرار پر واپس لے گئی، کچھ دیر کے بعد پھر لے آئی، لیکن میں نے کسی بچہ کے ہاتھ دوبارہ واپس کر دی، اور بعد میں، میں نے حضرت سے اس کی شکایت کی کہ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تو چٹنی کھائیں اور میرے لئے اہتمام سے سبزی یا اچھی سی دال بنا کر بھیجی جائے، مجھے آپ اتنا بے حمیت اور خود غرض نہ سمجھیں۔ حضرت نے اس واقعہ کو بالکل اہمیت نہ دی اور فرماتے رہے: پتہ نہیں، بچی نے آپ سے کیا کہہ دیا اور آپ اتنے متاثر ہو گئے، ارے بچے گھروں میں سب کچھ کھاتے رہتے ہیں، آخر میں میں نے ہی ہار مان لی اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔

اس طرح کے واقعات حضرت کے یہاں کے روزمرہ کے واقعات تھے، خیر حضرت تو حضرت تھے، لیکن این خانہ ہمہ آفتاب بود، اس معاملہ میں حضرت کی اہلیہ مرحومہ کا کردار مجھے حضرت سے بھی بلند معلوم ہوتا ہے، وہ عورت ذات، ایک مالدار بلکہ زمیندار خاندان کی پروردہ، اپنی ذات پر ہی نہیں اپنی

چھوٹی چھوٹی اولاد کے مقابلہ میں غیروں کو اس طرح ترجیح دیتی تھیں، اللہ نے کیسا دل گردہ اس بندی خدا کو عطا فرمایا تھا!!

آہ! اب جب یہ سب یاد آتا ہے، دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے، الٰہی!! اس جنتی جوڑے کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عنایت فرمائیے، اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کے ساتھ جوان حضرات نے احسان اور لطف وکرم کا معاملہ کیا ہے، اس کا اپنی شان عالی کے مطابق اجر عطا فرمائیے۔

میرے حافظہ میں اس طرح کے نہ جانے کتنے ہی واقعات ہیں، ایک واقعہ اور لکھتا ہوں، حضرت کی بڑی صاحبزادی کی شادی کو کچھ ہی دن گذرے تھے، ان کی سسرال کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، غالبًا ان کو سسرال لے جانا تھا، ان حضرات کا قیام دو تین دن ہتھورا میں رہا، ان لوگوں کی کئی کئی رشتہ داریاں اس گاؤں میں تھیں، ایک دن ان لوگوں کا رات کا کھانا مولانا کے ایک قریبی عزیز کے یہاں تھا، عصر کے بعد ذرا اچھی سی بارش ہوگئی اور گاؤں کے راستے خراب ہوگئے، جن صاحب کے یہاں دعوت تھی، انہوں نے حضرت کے گھر کھانا بھجوادیا، اور کہلا دیا کہ مہمان ہمارے یہاں تشریف نہ لائیں اس میں زحمت ہوگی، اللہ کا کرنا کہ مغرب کے کچھ دیر بعد کانپور کے کئی مہمان اچانک مدرسہ میں پہنچے، حضرت کو ان کے کھانے کی فکر ہوئی، گھر جا کر کانپور کے ان مہمانوں کا ذکر کیا اور کہا کہ کھانے کو کچھ ہے، اہل خانہ نے پوری بات بتادی، اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہم لوگوں کی دعوت بھی چونکہ وہاں تھی اس لئے ہمارے لئے بھی کھانا وہیں سے آیا ہے گھر کچھ نہیں پکا ہے، حضرت نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ یہ کھانا مدرسہ بھیج دو اور تم لوگ کچھ دلیہ یا چاول وغیرہ پکا لو۔ وہاں سے جو بچ جائے گا واپس آجائے گا، اور یہی ہوا گھر سے وہ کھانا آ گیا، کانپور کے مہمانوں نے کھایا اور جو بچا وہ اپنے مہمانوں کو کھلا دیا۔ اپنے سمدھیانہ کے مہمانوں کے مقابلہ میں مدرسہ کے مہمانوں کو ترجیح دینا بڑا مشکل کام ہے۔

ایک مرتبہ میں ندوے سے حاضر ہوا، دیکھتے ہی فرمایا: خوب آئے، میں سوچ ہی رہا تھا، ایک خورد

سال بیٹی اور دونواسیاں اس وقت کمرے میں تھیں، حضرت نے کہا! بچواب تم جاؤ، وہ بچے چلے گئے تو خود مچان پر سے مٹھائی کے چھوٹے چھوٹے بند ڈبّے اتار کر دیے، میں یہ کہتا ہوا اٹھا کہ آپ نے بچوں کو کیوں بھگا دیا؟ اور بچوں کو آواز دینے باہر نکلا، اتنے میں حضرت نے مٹھائی واپس اوپر رکھ دی، اور کہا: اب جایئے آپ کو بھی نہیں ملے گی، پھر فرمایا: میں ان کو ان کا حصہ دے چکا ہوں، پھر جب میں لکھنؤ آنے کے لیے روانہ ہونے لگا تو یہ کہہ کر وہ ڈبے مجھے دیے کہ ان کو لکھنؤ سے پہلے نہ کھولیے گا۔

فقر اختیاری:

حضرت نے کبھی مدرسے سے تنخواہ نہیں لی، بس اللہ پر توکل تھا، مختلف اوقات میں مجھ سے بارہا فرمایا: مولانا! ہمارے یہاں دال تو جب پکتی ہے جب کوئی مہمان آجاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہوتا ہے۔ جس میں جتنی استقامت اور پختگی ہوتی ہے اسی کے بقدر اس پر حالات رہتے ہیں، اور یہی اللہ کے بندوں کی ترقیات کا زینہ ہوتا ہے۔ حضرت کے یہاں ایک طویل عرصے تک خوب عسرت وتنگی کے حالات رہے، حضرت کے لیے مواقع تھے، چاہتے تو اپنے اور گھر والوں کے لیے کچھ آرام کی زندگی کا انتظام تو کر ہی سکتے تھے۔ مگر اللہ کا یہ بندہ دین کی محبت میں سرشار ومست، سب اپنے اختیار سے برداشت کرتا، دین کی دھُن میں لگا رہا۔

ساری زندگی گھر کچا رہا، کچھ حصہ کھپریل تھی، کچے گھر کی جو تکلیفیں ہوتی ہیں وہ سب خوب ہوتی تھیں، فرمایا کرتے تھے کہ جی چاہتا ہے چھت پکی ہو جائے، بارش میں ٹپکنے لگتی ہے، بچوں کی ماں ساری ساری رات بچوں کو پانی سے بچانے کے لیے ادھر ادھر ہوتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی اس کا موقعہ نہیں آیا کہ وہ پکا کرالیا جاتا۔

ہدیہ کا معمول:

ہدایا کے سلسلے میں بھی معمول یہ تھا کہ بس بقدر کفاف بلکہ نہایت کم مقدار میں اپنے لیے رکھتے باقی مدرسے میں دے دیتے۔ مدرسے میں کچھ تعمیری کام چل رہا تھا۔ ایک دن معمار نے آکر کہا دو چار دن میں چھت کے لیے ڈھولہ تیار ہو جائے گا۔ چھت کے لیے لوہا اور سیمنٹ وغیرہ آنا ہے، حضرت متفکر ہو گئے، مجھ سے فرمانے لگے: کیا کروں باندے میں جس جس سے قرض مانگ سکتا ہوں لے چکا ہوں، آخر ارادہ کیا کہ کانپور کے کچھ اہل تعلق سے کہا جائے، سفر کا ارادہ کیا، مجھ سے کہا میں کانپور جا رہا ہوں واپسی میں سریا اور سیمنٹ وغیرہ لیتا ہوا آؤں گا۔ اسی اثنا میں میں نے عرض کیا دو گاڑیوں سے مہمان آئے ہیں، اس فکر و پریشانی میں بے اختیار زبان سے نکلا: ایسے وقت میں مہمان کھل جاتے ہیں، میں نے ایک ہی مرتبہ حضرت کی زبان سے ایسے الفاظ سنے ہیں، بہر حال وہ مہمان آئے، حضرت نے حسبِ معمول ان کا خوب اکرام کیا، ان کی ضرورت پوری کی، حضرت نے مجھ سے اشاروں میں ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کو کہا، وہ سمجھ گئے اور کہنے لگے ہم لوگوں کو کھانا فلاں جگہ کھانا ہے، وہ چلے گئے تو میں نے حضرت کا چہرہ خوب کھِلا ہوا دیکھا، مسکراتے ہوئے کہنے لگے: ایسے مہمان بہت اچھے، ایسے مہمان بہت اچھے، بات یہ تھی کہ انہوں نے متفرق طور پر جو ہدایا پیش کیے ان کی مقدار گیارہ ہزار تھی، اور وہ چھت کی فوری ضرورت کے لیے کافی تھی۔ فرمایا: بس کام ہو گیا، اب میں سامان منگا لوں گا۔ کانپور جانے کی ضرورت نہیں۔

مولانا لکھنؤ میں ایک صاحب کے گھر تشریف لے گئے، انہوں نے عرض کیا: حضرت! بیٹا سعودی عرب سروس کے لیے چلا گیا ہے۔ اس نے پہلی تنخواہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بھیجی ہے۔ یہ کہہ کر وہ پیسے دینے لگے، وہ ایک خاصی بڑی رقم تھی۔ مولانا نے فرمایا: روکے رہیے، یہ بتائیے کہ آپ یہ

مدرسے کو دے رہے ہیں یا مجھے؟ انہوں نے کہا حضرت! یہ آپ کے لیے ذاتی ہدیہ ہے، فرمایا: کئی گانوؤں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں جن میں چھت پڑنی ہے یہ رقم ان میں لگادی جائے۔

حضرت مولانا نعمانیؒ نے مولاناؒ کی عسرت کی وجہ سے کلکتے کے ایک تاجر جناب حاجی سلیمان صاحب سے بات کی کہ ہمارے مولانا صدیق صاحب مدرسے سے تنخواہ نہیں لیتے، اور تنگی میں بسر کرتے ہیں۔ انہوں نے پانچ ہزار روپیے سالانہ ہدیہ پیش کرنا شروع کیا۔ یہ رقم اس زمانے میں بہت تھی۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا: اس میں سے ایک ہزار (یا فرمایا دو ہزار) میں لے لیتا ہوں باقی مدرسے میں دے دیتا ہوں۔

ایک عجیب واقعہ

ایک دفعہ حضرت کو کانپور تشریف لے جانا تھا، حضرت مفتی محمود صاحبؒ کانپور تشریف لانے والے تھے، دوپہر کا وقت تھا، جلد جلد اسباق سے فارغ ہوئے اور مدرسہ سے متعلق بہت سے کام انجام دئے۔ میں نے جلدی سے گھر سے کھانا منگوایا، کھانا وہی دو روٹی اور چٹنی، حضرت سے کھانے کے لئے عرض کیا، حضرت نے کسی قدر جھلاّہٹ کے ساتھ فرمایا: آپ کو کھانے کی پڑی ہے، مجھے بہت عجلت ہے، میں نے پھر عرض کیا، حضرت نے پھر انکار کر دیا، لیکن میں نے ذرا اصرار اور پختگی کے ساتھ اپنی درخواست عرض کی تو ایک روٹی کھالی اور کانپور چلے گئے۔ چوتھے دن دوپہر میں میرے نام حضرت کا ایک پرچہ نومیل سے آیا (نومیل حضرت کے مدرسہ سے ڈیڑھ میل دور سڑک پر ایک جگہ ہے جو باندا سے نومیل پر ہے وہاں کوئی آبادی نہیں ہے اسی لئے اس جگہ کا نام ہی نومیل پڑ گیا ہے۔ آنے والی بسیں ہتھورا کی سواریوں کو وہیں اتار دیتی ہیں اور باندہ جانے کے لئے وہیں سے مسافر سوار ہوتے ہیں)، اس پرچہ میں لکھا تھا: میرا کھانا اور ایک لوٹے میں پانی لیکر کسی طالب علم کو بھیج دیجئے۔ اور دو تین سائیکلوں کا انتظام کر کے

بھجوادیجئے، میں مدرسہ کی دال لایا ہوں، میں نے کھانا اور پانی تو فوراً دولڑکوں کے ہاتھ سائیکل سے بھیج دیا، اور یہ کہلا دیا کہ مزید سائیکلیں ابھی بھیج رہا ہوں۔ اور ان دونوں طالب علموں سے کہا کہ جب حضرت کھانا کھالیں تو تم میں سے ایک دال کی نگرانی کے لئے وہیں رک جائے اور دوسرا حضرت کو سائیکل پر بٹھا کر لے آئے، ان لوگوں نے یہی کیا۔ حضرت تشریف لے آئے، اور آتے ہی سلام کے بعد مجھ سے فرمایا؟ کشف ہوگیا تھا کیا؟ میں کچھ نہ سمجھ سکا تو دوبارہ فرمایا: کشف ہوگیا تھا کیا؟ میں نے عرض کیا: حضرت میں سمجھا نہیں، اس پر فرمایا کہ آپ نے جو ایک روٹی اصرار کرکے کھلادی تھی وہی کھائی تھی یا اب آپ کا بھیجا ہوا کھانا کھا کر آرہا ہوں، میں نے عرض کیا حضرت! کانپور میں کسی نے آپ کو کھانا نہیں کھلایا، فرمایا کسی نے بھی نہیں کھلایا۔ حضرت سے کھانے کے لئے اصرار کرنے کی ہمت کم ہی لوگوں کو ہوتی تھی، ورنہ اہل کانپور تو بچھے جاتے تھے۔

اپنے لئے احتیاط ہی پسند تھی

مولانا کے یہاں اساتذہ کی تنخواہیں تو واقعی کم تھیں، لیکن اور بہت سی سہولتیں ایسی تھیں جن سے تنخواہوں کی کمی کی تلافی ہوجاتی تھی، مثلاً اساتذہ کو مکانات بہت ہی کم کرایہ پر دئے جاتے تھے، اور حتی الوسع ہر خواہش منداستاد کو مولانا مکان فراہم کردیتے تھے۔ اسی طرح مطبخ کے لئے جو غلہ تیل وغیرہ فصل کے موقع پر خریدتے تھے، اس میں اساتذہ کے گھروں کے خرچ کا بھی لحاظ کرکے خریدتے تھے، اور فصل کے موقع پر جس نرخ سے غلہ خریدا گیا تھا اسی نرخ سے سال بھر اساتذہ کو دیتے رہتے تھے، یہ سامان قرض بھی دے دیا جاتا تھا اور قیمت قسطوار تنخواہ سے کٹتی رہتی تھی۔ رمضان المبارک سے پہلے شعبان میں رمضان کے خرچ کے لئے چاول، دالیں اور تیل وغیرہ مطبخ کے بند ہونے سے پہلے ہی دے دیا جاتا تھا۔

جس سال مولوی حبیب صاحب (حضرت کے بڑے صاحبزادہ) مدرس ہوئے ہیں، اسی سال شعبان کا واقعہ ہے کہ مطبخ کے ذمہ دار عام اساتذہ کو یہ سامان دے رہے تھے، مولوی حبیب صاحب اتفاقاً اُدھر سے گذرے (اس وقت مطبخ اتنا اندر نہ تھا) مولوی حبیب صاحب سے کہا کہ آپ کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیں، آپ بھی تو اب استاذ ہو گئے ہیں۔ مولوی حبیب صاحب نے ان کے کہنے پر دو یا تین کلو چنے کی دال قیمتاً لے لی، وہ دال لے کر نکل رہے تھے اور اُدھر سے حضرت تشریف لے آئے، دریافت فرمایا کیا ہے؟ آواز میں کرختگی تھی، بیچارے مولوی صاحب تو گھبرا گئے، غالباً مطبخ کے ذمہ دار نے ان کی طرف سے عرض کیا کہ دو کلو دال نقد قیمت دے کر لی ہے۔ میں نے حضرت کے غضب کا ایسا حال کبھی نہ دیکھا تھا، انتہائی سخت آواز میں مولوی حبیب احمد کو ڈانٹا اور فرمایا: تمہارے باپ کا مال ہے؟ میں بھیک مانگ کر تمہارے لئے لاتا ہوں؟ میں فوراً پہنچ گیا اور عرض کیا: وہ بھی مدرس ہیں، اور یہ سہولت تو سبھی مدرسین کے لئے ہے، لیکن حضرت کا غضب تو کسی طرح کم نہ ہوا، ہم سبھی لرز گئے، بیچارے مولوی حبیب احمد کا تو برا حال تھا، کسی طرح مطبخ واپس آ گئے اور وہ دال واپس کی۔

اپنے اور اپنے اہل خانہ کے بارے میں حضرت کی احتیاط کا یہی حال تھا۔ مدرسہ سے نہ کبھی تنخواہ لی اور نہ کوئی سہولت اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے مدرسہ سے حاصل کی۔ جس زمین پر مدرسہ بنا ہوا ہے اس کا اکثر حصہ مولانا کے اہل خاندان یا اعزہ کی ملکیت تھا، نیز جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا وہ بھی حضرت ہی نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ مدرسہ کی رقم اس میں صرف نہ کی تھی، مدرسہ کے کاموں سے سفر کرنا ہوتا تھا تب بھی حتی الوسع مدرسہ سے کرایہ نہ لیتے اور سفر میں کوئی معمولی سی تجارت کر لیتے، جس سے کرایہ نکل آتا۔ مدرسہ کے استاد مولانا سعد اللہ صاحب کی کرانہ کی دوکان تھی، کانپور تشریف لے جا رہے تھے، فرمانے لگے: مولوی سعد اللہ صاحب بتلایئے آپ کی دوکان کے لئے کانپور سے کیا لیتے آئیں جس سے ہمارا کرایہ نکل آئے، مولانا سعد اللہ صاحب نے عرض کیا: حضرت سن لائٹ صابن ہمیں باندہ

میں اس قیمت کا ملتا ہے، کانپور میں آپ کو اس سے کم قیمت پر مل جائے گا، آپ ایک پیٹی صابن لے آئیں ہم لے لیں گے، آپ کا کرایہ نکل آئے گا۔ مولانا کانپور سے واپسی میں ایک سن لائٹ صابن کی پیٹی لے آئے اور مولانا سعد اللہ صاحب کو دے دی، اس میں صابن کی قیمت اور مولانا کا کرایہ بھی نکل آیا اور چھ عدد سن لائٹ صابن بچ رہے، فرمایا: یہ غریب طلبا کے کام آجائیں گے۔

زندگی مسلسل سفر تھی

حضرت کے اسفار کا حال تو عام طور پر لوگوں کے علم میں ہے ہی۔ یہ سفر پیدل، سائیکل، بیل گاڑی، موٹر سائیکل، ٹرک، بس اور ٹرین سے ہر طرح فرماتے تھے۔ کاموں کے ہجوم کی وجہ سے کہیں قیام نہیں فرماتے تھے۔ اول سفر اور آخر سفر، پھر جن حضرات کی دعوت پر سفر فرماتے تھے ان میں بعض تو بہت ہی خود غرض ہوتے تھے، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حضرت تشریف لے آئیں خواہ حضرت پر کچھ بھی گزر جائے۔ اور اللہ کے بندے کسی راحت رسانی کا اہتمام بھی نہیں کرتے تھے۔ مجھے بھی حضرت کے ساتھ ایسے سفر کرنے پڑے ہیں۔ لیکن ساری مصیبتوں اور اسفار کی صعوبتوں کے باوجود کبھی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ بہت سے اللہ کے بندے تو واجبی کرایہ تک نہ دیتے تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ لوگ دور دراز دیہات میں لے گئے، اور واپسی کا کوئی نظم نہیں کیا، حضرت کو خود نظم کر کے واپس آنا پڑا۔ جب تک جان میں جان رہی کسی کی دل شکنی نہیں کی، خواہ کچھ بھی گذر جائے۔ جو باتوفیق بندے کرایہ پیش بھی کرتے تو اولاً تو حضرت انکار فرماتے، اور اگر وہ اصرار فرماتے تو صرف بہ قدر ضرورت ہی کرایہ لیتے۔

گونڈہ ضلع کے ایک صاحب نے، جو خود بیمار تھے، کچھ آدمی بھیج کر حضرت کا وقت اپنے یہاں کے لیے لیا۔ حضرت کے ساتھ لکھنؤ سے میں بھی گیا، ٹرین میں اتنی بھیڑ تھی کہ ہم دونوں نے پوری رات فرش

پر بیٹھ کر گزاری۔ اسٹیشن پر داعی صاحب کا کوئی آدمی نہیں ملا، مدرسہ فرقانیہ کے لوگ ملے، وہاں کوئی میٹنگ تھی حضرت کو اس میں بھی شریک ہونا تھا، مدرسے سے تقریبا گیارہ بجے فارغ ہوئے، اس وقت تک بھی داعی صاحب کا کوئی آدمی نہیں آیا۔ حضرت نے ان کے گاؤں جانے کی فکر ظاہر کی، وہاں کے لوگوں نے سواری کی تلاش شروع کی، آخر ڈاکٹر زکریا صاحب سے حضرت نے کہلایا، انہوں نے عرض کیا حضرت پہلے سے معلوم نہیں تھا، میری گاڑی کچھ مرمت کے لیے آج ہی کھولی گئی ہے، وہ اتنی جلدی تیار نہیں ہوسکتی۔ اسی اثنا میں کلکتے کے کچھ حضرات گاڑی سے پہنچے، معلوم ہوا وہ لکھنؤ میں حضرت سے ملنا چاہتے تھے، حاجی لئیق صاحب مرحوم کے یہاں حضرت کا قیام تھا۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ حضرت صبح چلے جائیں گے آپ علی الصبح آکر مل لیں، ان کو اندازہ نہیں تھا کہ مولانا کی صبح اتنی جلدی ہوجاتی ہے، وہ آئے تو ہم لوگ نکل چکے تھے، وہ پیچھے پیچھے گونڈے پہنچے، حضرت نے ان سے ملاقات کی اور کہا ہمیں آپ فلاں گاؤں تک، جو زیادہ دور نہیں تھا، پہنچادیں۔ کچھ دور تک ان کی گاڑی سے گئے، مگر راستہ کچا اور اتنا خراب ملا کہ انہوں نے کہا ہماری گاڑی چھوٹی ہے اس راستے پر چل نہیں پائے گی۔ اس سے اترے، اور حضرت کو ایک سائیکل پر سوار کرایا گیا اور میں پیدل۔ گاؤں والوں کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے ٹریکٹر بھیجا، پھر ہم لوگ ٹریکٹر سے وہاں پہنچے۔ واپسی بھی اسی شان سے ہوئی۔ ٹرین میں پھر ایسی ہی بھیڑ تھی، بڑی مشکل سے سوار ہوئے، جنرل ڈبے میں فرش پر بیٹھ کر پوری رات کاٹی، حضرت نے فرش پر بیٹھے بیٹھے ایک سیٹ سے سر لگا کر کچھ نیند نکالی، فجر میں لکھنؤ اترے۔ میں ندوے آگیا اور حضرت باندہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

سنبھل کا سفر ہوا، میرے چھوٹے چچا حضرت مولانا حکیم محمد احسن صاحبؒ نے جن کی درخواست پر یہ سفر ہوا تھا، میرے ذریعہ حضرت کی خدمت میں ٹرین کے فرسٹ کلاس کے کرایہ کے حساب سے رقم پیش کی۔ (یہ فرسٹ کلاس بغیر اے سی کے تھری ٹائر سے ذرا بہتر درجہ ہوتا تھا، ابھی بھی کچھ ٹرینوں میں

ہوتا ہے) حضرت نے فرمایا: رقم تو بہت زیادہ ہے۔انھوں نے کہا کہ میں اپنی ذاتی رقم میں سے یہ پیش کررہاہوں، مدرسہ کے پیسے نہیں ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ فرسٹ کلاس سے تشریف لے جائیں، یہ سن کرفرمانے لگے: مسلمانوں کے پیسے اس کام کے لئے ہیں؟ میں ساری رات اسٹیشن پر پڑا رہوں گالیکن فرسٹ کلاس سے نہ جاؤں گا۔

مولانا کے اسفار میں سے بعض اسفار ایسے ہوتے تھے جو ہم لوگوں کی نظر میں بالکل غیر ضروری ہوتے تھے، لیکن حضرت کی دوررس نگاہ میں اس کے بہت سے فائدے ہوتے تھے۔ایک بار دوپہر کو اسباق سے فارغ ہوکر سائیکل کے ڈنڈے پر سوار ہوکر ایک جگہ جارہے تھے۔میں نے مقصد سفر معلوم کیا تو کافی کریدنے کے بعد بتایا: فلاں گاؤں میں ایک بچے کی ختنہ ہے، مجھے واقعی حضرت کا یہ سفر بہت ناگوار ہوا، میں نے عرض کردیا کہ یہ بھی کوئی وجہ سفر ہے؟ حضرت مولانا نے فرمایا ''مولانا ان کی ہگنی متنی میں شریک ہوکر میں نے ان کو دین کی بات پہنچائی ہے'' یہ مولانا ہی کے الفاظ تھے۔۔کافی دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ اللہ کے اس بندے نے اس طرح کی تقریبات میں شرکت کرکے دین کے کام کے لئے کیسے راستے ہموار کئے ہیں۔

خدمت خلق

حدیث شریف میں خدمت خلق کی بڑی عظمت بیان فرمائی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ کی مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، جو لوگ مخلوقِ خدا کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، وہ اللہ کو بہت محبوب ہوتے ہیں۔خدمت خلق کے معاملے میں بھی حضرت اپنی مثال آپ تھے، کسی کی کسی طرح کی بھی ضرورت ہو، خواہ بچوں کی شادی بیاہ، یا مریضوں کے علاج معالجہ کا مسئلہ، یا کسی کو ملازمت دلوانا اوراس سلسلہ میں کوشش کرنا، حضرت سے وہ عرض کردے یا کسی طرح حضرت کے علم میں آجائے، اب

بس حضرت پر گویا واجب ہو گیا کہ اس کی جو مدد بھی کر سکتے ہوں کریں۔ کتنے ہی مریضوں کے ساتھ بمبئی ، کانپور، لکھنؤ، باندہ شہر اور اللہ جانے کہاں کہاں کے سفر کیا کرتے تھے۔ اور اس میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی مدد فرماتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد جن کی ملازمتوں کے لئے حضرت نے کوشش کی سیکڑوں نہیں ہزاروں ہوگی۔ شادی کرانے کا تو ہمارے حضرت نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، کتنے ہی لوگ ہوں گے جن کے گھر حضرت نے بسائے ہوں گے اور وہ اس سلسلے میں حضرت کے مرہون منت ہوں گے۔

وقت کی قیمت کا احساس

دنیا میں ہر چیز کا بدل مل سکتا ہے لیکن وقت ایسی چیز ہے کہ اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس کی تلافی ناممکن ہے، اور ہم لوگوں میں سب سے زیادہ ناقدری کے شکار ہمارے اوقات ہی ہیں۔

مولانا کے نزدیک اپنے وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی، وہ جن کاموں میں اپنے اوقات کو صرف کرتے تھے، ان کو دین سمجھ کر ہی اپنا وقت لگاتے تھے۔ مدرسہ میں بڑی بڑی اور مشکل کتابوں کے پڑھانے کے ساتھ ساتھ تعمیرات کا انتظام بلکہ عموماً اس کے کاموں میں شرکت، مدرسہ کے مطبخ کی فکر اور اس کے لئے بھی وقت خرچ کرنا، مہمانوں کی میزبانی بلکہ ان کے لئے ہر طرح کے اکرام اور راحت رسانی کی فکر، اور روزانہ ہزاروں نہ سہی سیکڑوں کے اوسط سے تو یقیناً تعویذوں کا لکھنا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔

اس کے علاوہ معمولات کی پابندی، اپنے معمولات سفر و حضر کسی میں بھی نہ چھوڑتے تھے۔ بلکہ سفر میں تو تلاوت کا زیادہ ہی اہتمام فرماتے تھے، میں ایک بار بمبئی کے سفر میں ساتھ تھا، لکھنؤ سے یہ سفر ہوا تھا، کانپور میں بھی کچھ حضرات ملنے کے لئے آئے پھر جھانسی میں بھی رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے کچھ

لوگوں نے ملاقات کی، ضرورت مندوں کو بھی حضرت کا پروگرام معلوم رہتا تھا۔ جھانسی سے رات کے دو بجے کے قریب گاڑی چلی تھی۔ مجھے تو دوبارہ نیند آ گئی لیکن حضرت اپنی تہجد میں مشغول ہو گئے، ۳ بجے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نماز سے فراغت کے بعد دعا و مناجات میں مشغول ہیں۔ بمبئی کا یہ سفر بمبئی کے بعد بھٹکل کرناٹک تک تھا۔ بھٹکل کے قریب انتہائی حسین وجمیل قدرتی مناظر ہیں۔ سفر کے دوران میں ان کو دیکھنے لگا، اور ایک دو بار حضرت کو بھی متوجہ کیا، حضرت ایک لمحہ کے لئے توجہ فرماتے، اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ میں نے ایک بار مزید عرض کر دیا کہ حضرت دیکھئے تو کتنا حسین منظر ہے! حضرت نے قدرے بیزاری کے ساتھ فرمایا: ان کا کیا دیکھنا؟ اور اپنے کام یعنی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

غیرت اور دینی حمیت

مولانا کے مزاج میں انتہائی انکساری اور تواضع کے باوجود غیرت و استغناء اور دینی تصلّب بہت تھا۔ کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کہ مولانا نے کسی بھی دنیوی غرض سے خواہ وہ مدرسہ ہی کی کیوں نہ ہو کسی کی خوشامد کی ہو۔ میری مدرسی کا ابتدائی دور کا واقعہ ہے، حضرت نے سنایا کہ باندہ شہر کے فلاں صاحب نے ایک صاحب کے متعلق جو کچھ مالدار تھے، ذکر کیا کہ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ میں خود حاضر ہو جاؤں گا، لیکن یا تو مولانا بھول گئے یا کثرت مشاغل نے ملاقات کا موقع نہیں دیا، چند دن کے بعد ان صاحب نے پھر تقاضہ کیا اور یہ بھی ذکر کر دیا کہ وہ آپ کے مدرسہ کو پانچ سو روپے دینے کا تذکرہ کر رہے تھے، اس وقت پانچ سو روپے کی بہت اہمیت ہوتی تھی ایک مدرس کی آٹھ دس مہینہ کی تنخواہ تو کم از کم اس سے ادا ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن مولانا کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ روپیوں کے لئے مولانا ان سے ملنے جائیں۔ آخر انھوں نے وہ رقم خود بھیج دی اور بعد میں حضرت ان سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔

دینی تصلب اور کسی کی بھی خاطر دین کے معاملے میں مداہنت نہ کرنا بھی حضرت کی بہت نمایاں خوبی تھی، لیکن زبان سے اس کا ذکر نہ کرتے تھے۔ عملاً بہت پختہ تھے، ایمرجنسی کے زمانہ میں باندہ ضلع کے کلکٹر جو شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ایک وزیر جو مسلمان ہی تھے، مولانا سے نس بندی کے جواز پر فتوی لینے کے لئے حاضر خدمت ہوئے، حضرت اس وقت باندہ شہر کی جامع مسجد میں معتکف تھے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، مولانا نے بہت ہی نرم کلامی سے کام لیا اور ان سے یہ فرمایا کہ ہمارے بڑے لکھنؤ اور دہلی میں موجود ہیں، آپ ان سے فتویٰ لے لیں، ہر ہر شخص سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ لوگ تو مولانا ہی سے جواز کا فتویٰ لینا چاہتے تھے، اپنی درخواست پر مصر رہے، اثناء گفتگو میں کلکٹر صاحب کی زبان سے یہ نکل گیا کہ مولانا آپ اس کی فکر نہ فرمائیں کہ باندہ کا کوئی شخص آپ کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکال سکتا ہے، مولانا کو اس پر بہت غصہ آیا اور فرمایا: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں جائز اور ناجائز کا مسئلہ لوگوں کی رضامندی کی بنیاد پر اور ان کے خوف اور بے خوفی کی بنیاد پر بتاؤں گا؟ لہجہ سخت تھا، اس لئے کلکٹر صاحب کے مصاحبین میں سے کسی نے کہا: مولانا آپ کو معلوم ہے آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟ مولانا نے اسی سخت لہجہ میں جواب دیا کہ میں جانتا ہوں یہ کلکٹر ہیں اور یہ وزیر، اور پھر یہ بھی کہا کہ جو کچھ آپ حضرات کر سکتے ہوں کر لیں میں نسبندی کے جواز کا فتویٰ نہیں دوں گا۔

آخر وہ بیچارے چلے آئے۔ اور مولانا کی مقبولیت کی وجہ سے کچھ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ورنہ ایمرجنسی کا دور تو بس العیاذ باللہ۔

اصحاب مدارس کے لئے خاص نمونہ

ان سطروں کے لکھتے وقت مجھ پر ان باتوں کا گہرا اثر ہے، ہائے! کیسے نمونے کی شخصیت ہمارے بیچ سے رخصت ہوگئی۔ آنکھیں بار بار اشک بار ہو رہی ہیں۔ ان کی باتیں ہی ایسی تھیں جنہیں یاد کر کے

بے اختیار رونا آتا ہے۔حضرت کے یہاں ایسے واقعات کوئی نادر چیز نہیں تھے۔ مجھے بھی بہت سی باتیں یاد ہیں۔لوگوں کے لئے ان میں بڑا سبق ہے۔حضرت کے واقعات ہم اہل مدارس کے لئے خصوصا غیر معمولی مفید بلکہ بے حد ضروری ہیں۔ ان میں ذمہ داران مدارس، مدرسین اور طلبہ سب ہی کے لئے بہترین نمونہ اوراسوہ حسنہ ہے۔

ان واقعات میں مولاناؒ کی بے نیازی، بانی وناظم مدرسہ ہونے کے باوجود اساتذہ کے اکرام، ان کے آرام کا لحاظ، مدرسہ کی خدمت، طلبہ کے ساتھ حسن سلوک، درس کی پابندی اور دین کی خدمت کے لئے قربانی دینا اوراس طرح کی بہت سی باتیں آجاتی ہیں، ذیل میں اس طرح کی کچھ اور یادیں ذکر کرتا ہوں۔

پبلک لانڈری لکھنؤ کے مالک جناب حاجی رفیق صاحبؒ ایک دن میرے پاس عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ کے مکان پر تشریف لائے۔اور تنہائی میں مجھ سے یہ ذکر کیا کہ مولانا صدیق صاحب کے کمرے میں پنکھا نہیں ہے،مولانا کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ میں نے پنکھا خرید لیا ہے،خود پیش کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آپ ہتھورا چلے جائیں اور مولانا کی خدمت میں یہ پنکھا پیش کردیں۔ مجھے امید ہے کہ مولانا آپ کے کہنے پر اس کے لئے تیار ہو جائیں گے۔کسی اور کو تو ہمت نہ ہوگی اور نہ مولانا کسی کے کہنے پر اس کے لئے تیار ہوں گے۔ میں ان دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء آچکا تھا، لیکن باندہ آمدورفت کافی رہتی تھی۔ میں قریبی جمعرات کو باندہ چلا گیا۔جب مدرسہ پہونچا تو حضرت وہاں تشریف نہ رکھتے تھے، میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور پنکھا لگانے کے لئے حضرت کا کمرہ کھلوایا۔لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کمرہ کی چھت میں پنکھا لٹکانے کے لئے کنڈا نہیں ہے۔ بہت غور وفکر کے بعد بھی کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ چھت یا دیواروں کے اوپری حصہ میں توڑ پھوڑ کر کے کوئی کنڈا یا پائپ لگایا جائے اور اس میں پنکھا لٹکا دیں۔ دوسرے دن حضرت تشریف لے آئے۔میں نے اپنی

حاضری کا مقصد عرض کر دیا اور حاجی صاحب کی درخواست بھی اس صراحت کے ساتھ پیش کر دی کہ پنکھا آپ کے لئے ہے، مدرسہ کے لئے نہیں۔ پہلے تو مولانا نے وہی عذر کیا کہ کمرہ کی چھت میں کنڈا نہیں ہے۔لیکن جب ہم لوگوں نے (میرے ساتھ اس کام میں وہاں مولوی منظور اور ایک دو شخص اور شریک تھے) اس کا متبادل ذکر کیا اور اپنی درخواست پر اصرار کیا، تو مولانا نے دوسری باتیں شروع کر دیں کہ مجھے زیادہ گرمی نہیں لگتی ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اسی کمرہ میں گرمی میں بھی سوجاتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔لیکن میں نے اپنا اصرار جاری رکھا اور عرض کیا کہ حاجی صاحب نے مجھے اسی کام کے لئے بھیجا ہے۔اوران کے کہنے کے مطابق انہوں نے میرا انتخاب اسی لئے کیا ہے کہ میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں۔ ورنہ پنکھا تو کسی کے بھی ساتھ آ سکتا تھا۔تو آخر میں مولانا نے دل کی بات کہہ ہی دی۔فرمایا: آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں عام طور پر اساتذہ کے پاس پنکھے نہیں ہیں۔ یہ بات میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے کمرہ میں پنکھا لوں اور دیگر اساتذہ کے کمروں میں پنکھے نہ ہوں۔ جب سب اساتذہ کے کمروں میں پنکھے ہو جائیں گے میں بھی لگوا لوں گا۔فی الحال آپ اس کو دفتر میں رکھوا دیں۔ میں حاجی صاحب کے نام خط لکھ دوں گا۔آپ میرا خط پہنچا دیں۔ پھر مولانا نے حاجی صاحب کے نام ایک خط، جس میں معذرت بھی تھی اور میری کوشش کا ذکر بھی تھا،لکھ دیا۔

نہایت سادہ زندگی

حضرت کی پوری ہی زندگی نہایت سادہ اور سخت کوشی کی تھی۔مجاہدہ تو ایسا کہ اس کی کوئی نظیر بھی شاید اس دور میں نہیں دیکھی گئی، ایک دن میں نے عرض کیا کہ اگر جنت میں جانے کے لیے ایسا مجاہدہ ضروری ہے تو ہم لوگ کیا کریں؟ فرمایا: نہیں، میں تو مجبور ہوں، یہ کہہ کر بات ٹال دی۔شادیوں میں خرچ کے حضرت سخت مخالف تھے، اپنے گھر کی شادیاں نہایت سادہ کیں۔رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

صفیہ سے نکاح کیا تو ولیمہ اس طرح ہوا کہ صحابہ سے کہہ دیا اپنا اپنا کھانا لے آؤ، ساتھ بیٹھ کر کھالیا گیا اور ولیمہ ہوگیا۔ میں نے اس سنت کی اتباع بس ایک ہی مرتبہ دیکھی، مولوی حبیب صاحب کا ولیمہ حضرت نے اسی طرح کیا، اساتذہ سے کہلا دیا کہ اپنا اپنا کھانا لے آئیں، ہم لوگ حضرت کے کمرے میں کھانا لے کر پہنچ گئے۔ حضرت کے گھر سے آلو کی سبزی اور بگھرے چاول بن کر آئے تھے۔ جب کھانے سے لوگ فارغ ہونے لگے تو مسکراتے ہوئے فرمایا: یہ حبیب کا ولیمہ تھا۔ ہم لوگوں نے بیک آواز کہا: یہ نہیں مانا جائے گا، فرمایا: میری طرف سے تو ہوگیا۔

حقیقی کسر نفسی

میں وہیں پڑھتا تھا، برسات کا زمانہ تھا کئی دن سے شدید اور مسلسل بارش ہورہی تھی، رُکنے کا نام نہ لیتی تھی، مدرسہ کے قریب نالہ میں طغیانی آئی ہوئی تھی، گاؤں والوں کے مکانات کا بھی بہت نقصان ہوا تھا، اور کھیتی بھی بہت برباد ہوئی تھی۔ ایسی بارش اور سیلاب برسوں کے بعد آیا تھا۔ حضرت سے لوگ دعا کی درخواست کررہے تھے، حضرت خود بھی دعا کررہے تھے اور دوسروں کو بھی تاکید کرتے تھے۔ نمازوں کے بعد بھی دعا کا اہتمام مدرسہ کی مسجد میں ہورہا تھا۔ اسی اثناء دوپہر کے وقت جب کہ بارش شدید تھی، مدرسہ کے درمیانی پھاٹک (جس کے اوپر آج کل کتب خانہ کی عمارت ہے) کی مشرقی دیوار کے نیچے سے پانی نکلنا شروع ہوگیا۔ ہم سب یہ سمجھے کہ بارش کی شدت اور سیلاب کی وجہ سے زمین کے اندر کے پانی کی سطح اونچی ہوگئی ہے اور زمین کے نیچے سے یہ چشمہ پھوٹ نکلا ہے، اور اس کی وجہ سے اب عمارت کے بیٹھ جانے کا خطرہ ہے، میں نے جاکر یہ بات حضرت سے عرض کی، حضرت ہم سب کو لے کر اس جگہ تشریف لائے اور قریب سے مٹی کھود کھود کر دیوار کی جڑ میں ڈالنے لگے، اس کام میں حضرت خود بھی لگے ہوئے تھے، لیکن پانی کسی طرح قابو میں نہ آیا تو بے قرار ہوکر مسجد کے صحن میں آگئے۔ اور وہیں

بارش میں کھڑے کھڑے دعا شروع کردی۔ دعا کے چند جملوں کے بعد بے اختیار چیخ نکلی اور پھر یہ الفاظ بھی: میرے اللہ! میرے گناہوں کی سزا مدرسہ کو نہ دیجئے گا۔ روتے جاتے تھے اور بار بار یہی الفاظ دوہراتے جاتے تھے: میرے اللہ میرے گناہوں کی سزا مدرسہ کو نہ دیجئے گا، الٰہی! میری بداعمالیوں کا وبال مدرسہ پر نہ پڑے'' اساتذہ اور طلبہ کی خاصی تعداد مسجد کے کچے صحن میں کھڑے کھڑے دعاؤں اور گریہ وزاری میں مصروف تھی۔ آخر اللہ نے فضل وکرم فرمایا اور تھوڑی دیر بعد ہی بارش کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اور پھر موسم صاف ہی ہوگیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پانی دراصل چھت کے پھٹ جانے کی وجہ سے دیوار کے اندر نیچے تک اتر آیا تھا اور نیچے دیوار کی جڑ سے نکل رہا تھا۔

مدرسہ کے اساتذہ کے ساتھ حسن سلوک کی ایک مثال

میری مدرسی کا دوسرا سال تھا، ان دنوں ایک چوٹ کے نتیجے میں میری ٹانگ میں شدید درد رہا کرتا تھا، جس کی وجہ سے میں بے چین رہتا تھا اور حسب استطاعت علاج ومعالجہ کرتا رہتا تھا، اسی علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ آیا اور پھر لکھنؤ سے اپنے وطن سنبھل چلا گیا۔ دونوں جگہ قیام میں تقریباً پورا ایک مہینہ لگ گیا۔ جب میں سنبھل سے باندہ کے لئے روانہ ہونے لگا، تو بڑے بھائی جناب مولانا ظہیر عالم صاحبؒ نے فرمایا کہ تم پورے مہینہ مدرسہ سے غائب رہے ہو، گھر سے اپنے خرچ کے لئے پیسے لے جاؤ اور مدرسہ سے اس ماہ کی تنخواہ نہ لینا، میں گھر سے آئندہ ماہ کے خرچ کے لئے پیسے لے کر چلا آیا، سنبھل سے باندہ جانے کے لئے راستہ میں لکھنؤ پڑتا ہے، اس لئے ایک رات دن لکھنؤ بھی قیام رہا۔ صبح کو باندہ جانا تھا، رات کو عم محترم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے بھی بالکل وہی بات کہی جو بھائی صاحب نے کہی تھی، اور ساتھ میں پچاس روپئے بھی دینے لگے۔ میں نے ان سے بھائی صاحب کی بات عرض کردی اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں گھر سے آئندہ مہینہ کے خرچ کے لئے پیسے لے آیا ہوں، مختصر یہ کہ میں اس ارادہ کے

ساتھ مدرسہ پہنچا کہ اس ماہ کی تنخواہ نہیں لینی ہے، حضرت کے مدرسہ میں تنخواہ دینے کا معمول یہ تھا کہ پہلی ہی تاریخ کو حضرت اساتذہ کو بلاتے تھے، اور اساتذہ حضرت کے کمرے ہی میں جا کر تنخواہ لے لیتے تھے، اگر کوئی استاد کسی وجہ سے وہاں نہیں جا سکتے تھے تو حضرت ان کو مسجد میں یا ان استاد کے کمرے پر جہاں بھی ملاقات ہو جائے تنخواہ دے دیا کرتے تھے۔ میرے مدرسہ پہنچنے کے بعد حضرت نے تنخواہ دینے کے لئے مجھے دو تین بار یاد فرمایا، میں حاضر نہیں ہوا تو ظہر کے بعد مسجد ہی میں خود ملاقات کی اور فرمایا: میں نے دو تین بار آپ کو بلایا، آپ تشریف نہیں لائے، میں نے اپنی بات سنبھل سے لے کر لکھنؤ تک پوری ذکر کر دی، اور خاص طور پر یہ کہ میں پیسے لے کر آیا ہوں، حضرت جیب سے رقم نکال کر مجھے دینے لگے اور میرے لینے پر اصرار بھی کرنے لگے، اسی اصرار و انکار میں میری زبان سے یہ نکل گیا حضرت جب میں نے پورے مہینہ پڑھایا نہیں تو میرے لئے تنخواہ لینا کیسے جائز ہے؟ حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا: مسئلہ ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی جب میں اپنے انکار پر قائم رہا، تو حضرت کو اصلی بات کہنی پڑی، اور وہی اس پورے واقعہ کے ذکر کرنے کا مقصود اور اس قصہ پارینہ کا حاصل ہے۔ فرمایا: مولانا! (حضرت اپنے یہاں کے اساتذہ کو مولانا ہی کہتے تھے) جس دن سے آپ گئے ہیں، میں نے آپ کے اسباق آپ کی طرف سے پڑھائے ہیں، آپ کے ایک سبق کا ناغہ نہیں ہوا ہے''۔

آہ! یہ بے مثال باتیں بس انہی کے ساتھ چلی گئیں۔

ایثار وقربانی کا نادر نمونہ

ایک بار سخت سردی کے موسم میں رات کو دس بجے ایک طالب علم نے میرے مکان پر، جو مدرسہ ہی میں تھا آ کر یہ اطلاع دی کہ حضرت کو بخار ہے، اور سخت سردی کا احساس ہے کپکپی چڑھی ہوئی ہے، مسجد میں لیٹے ہوئے ہیں، زور زور سے کراہ رہے ہیں، یہ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے عشاء کی نماز کے بعد

کہیں سفر سے واپسی ہوئی ہے لیکن میری ملاقات ابھی نہ ہوسکی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس وقت کیا کیا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ حضرت بھوکے بھی ہوں گے، اس لئے وقتی طور پر انڈے کا حلوہ اور اچھی سی چائے بنا کر گرم گرم لے کر حضرت کی خدمت میں پہنچ گیا، سلام کیا، حضرت نے لحاف کے اندر ہی سے سلام کا جواب دیا۔ حالت اب بھی وہی تھی جو طالب علم نے بیان کی تھی، سردی کی وجہ سے بولنا بھی مشکل تھا، بخار خاصا تیز تھا۔ میں نے عرض کیا حضرت! چائے پی لیجئے، سردی میں کچھ کمی ہوجائے گی۔فرمانے لگے: میرے ساتھ کانپور کے فلاں مہمان آئے ہیں، فلاں کمرے ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کو پلا دیجئے۔ میں نے کہا ان کو بھی پلا دوں گا، آپ تو پی لیجئے، یہ تو میں آپ کے لئے ہی لے کر آیا ہوں۔ بمشکل تمام تھوڑی سی چائے پی لی اور تھوڑا سا حلوہ کھالیا۔ جب میں واپس ہونے لگا اور یہ عرض کیا کہ میں ابھی ان کو بھی چائے پلا دوں گا، تو فرمانے لگے اب تو وہ مہمان سوگئے ہوں گے آپ زحمت نہ کریں۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ایسی مہمان نوازی اور ایسا ایثار موجودہ دور میں نہ کہیں دیکھا اور نہ سنا۔

تربیت کے نرالے انداز

اہل تعلق کی تربیت کے انداز بھی بڑے نرالے تھے۔ ایک صاحب جناب منور خاں صاحب تھے، اصل وطن تو میرٹھ ضلع تھا، لیکن بجلی کے محکمہ میں افسر اعلیٰ ہوکر باندہ پہنچے تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے، لیکن طبعاً بہت ہی شریف، وہ بھی اور ان کے بچے بھی۔ باندہ ضلع میں آنے والا ہر مسلمان افسر حضرت کی محبت اور اعتقاد کا اسیر جلد ہی ہوجایا کرتا تھا، منور صاحب نے بھی حضرت کی خدمت میں آمد ورفت شروع کردی، وہ اپنی گاڑی سے آتے تھے، حضرت ان کے لئے چائے کا اہتمام فرماتے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ منور صاحب دسترخوان پر بیٹھے ہوئے چائے ناشتہ میں مشغول تھے حضرت

نے وہیں سے کچھ کھانے کا سامان اٹھایا اور ایک پیالی چائے لے کر خود ڈرائیور کو دے آئے۔ منور صاحب پر جو اس کا اثر ہوا ہوگا ظاہر ہے، کہ وہ حضرت کے بہت ہی معتقد تھے۔ اس کے بعد بس ایک دو بار ہی ڈرائیور کو چائے وغیرہ بھیجنی پڑی، اور منور صاحب سمجھ گئے کہ حضرت یہ چاہتے ہیں کہ ڈرائیور کو بھی ساتھ ہی بٹھا کر کھلایا جائے، اور پھر یہ ہی ہونے لگا۔

حضرت کے یہاں ایسا ہی لطیف انداز تربیت تھا۔

حسن تربیت کا ایک نمونہ

جب میں وہاں پڑھاتا تھا، اس زمانے میں حضرت کی برکت، حسن تدبیر اور دعاؤں کے نتیجہ میں مدرسہ کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اساتذہ کا باہمی تعلق بالکل گھر کے افراد اور اہل خاندان کی طرح تھا۔ اگر کبھی کسی کو کسی دوسرے سے کوئی شکایت بھی ہو جاتی تو خود ہی دو چار دن میں یا حضرت کے علم میں آنے پر ختم ہو جاتی۔ حضرت کو اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ اساتذہ کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور شفقت کا جذبہ ہی رہے، اس پس منظر میں ایک مختصر سا واقعہ پڑھ لیجئے۔

اس زمانے میں مدرسہ کی کوئی مجلس شوریٰ نہ تھی، مجلس شوریٰ تو بہت بعد میں وجود میں آئی ہے۔ کسی اہم مسئلہ کے پیش آنے پر اساتذہ ہی کو مشورہ کے لئے بلایا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر کسی مسئلہ میں میری اور مولانا نفیس اکبر صاحبؒ کی رائے میں اختلاف تھا، مولانا مجھ سے ہر طرح سے بڑے تھے، وہ اس وقت بھی صدر المدرسین تھے، اور حضرت کی عدم موجودگی میں نظم واہتمام کی ذمہ داریاں بھی انہی کے ذمہ رہتی تھی۔ میرے نزدیک مولانا کی رائے بالکل قابل قبول نہ تھی، ہم دونوں میں بہت ہی اچھا تعلق تھا، مولانا ہر طرح بڑے ہونے کے باوجود میرا اکرام ہی فرماتے تھے، اور میں بھی مولانا کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ لیکن اختلاف رائے میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا: ’’مولانا آپ کو اپنی رائے پر بہت

اصرار ہوتا ہے"۔اور ظاہر بات ہے لہجہ بھی کچھ نامناسب ہی رہا ہوگا۔مولانا نفیس اکبر صاحبؒ نے فرمایا: میرا خیال آپ کے بارے میں بھی یہی ہے۔اس کے بعد مجلس زیادہ دیر نہ چلی اور غالباً اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ہم لوگ مجلس والے کمرے سے نکل آئے،اور فوراً ہی میں نے مولانا نفیس اکبر صاحبؒ سے اپنے جملہ اور طرز عمل کی معذرت کی۔مولانا نے فرمایا کہ میں نے بھی پورا جواب دے دیا تھا،اس میں معذرت کی کیا بات ہے؟ بہر حال ہم دونوں کے دل بالکل صاف رہے۔اور اسی طرح بشاشت اور محبت وشفقت کے ساتھ ملتے رہے۔لیکن حضرت کو اس بات کا خیال رہا۔چند دن کے بعد مجھے کسی کام سے لکھنؤ آنا تھا،آتے وقت جب حضرت سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو فرمایا کہ مولانا نفیس اکبر صاحب سے مل لئے؟؟ اس طرح کا سوال بالکل نیا تھا۔میں نے عرض کیا:نہیں،مولانا سے ملاقات تو نہیں ہوئی۔فرمایا:مل لیجئے۔میں وہاں سے آیا اور مولانا نفیس اکبر صاحب سے ملاقات تو کرلی،لیکن ذہن نے آگے کام نہیں کیا،چند دن بعد جب لکھنؤ سے ہتھورا واپس آیا اور حضرت سے ملاقات ہوئی تو حضرت نے پھر وہی بات کہی کہ مولانا نفیس اکبر صاحب سے مل لیجئے گا۔اب میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شاید حضرت یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم دونوں کے دلوں میں کچھ مَیل ہے،اور چونکہ غلطی میری تھی اور میں ہر طرح چھوٹا بھی تھا اس لئے حضرت یہ چاہتے تھے کہ صفائی بھی میں ہی کروں۔جب میں نے یہ سمجھ لیا تو کئی بار حضرت کے سامنے مولانا نفیس اکبر صاحب کے ساتھ اپنے حسن تعلق کا عملی اور قولی اظہار کردیا۔بس وہ مطمئن ہوگئے۔پھر کسی ایسے موقع پر وہ سوال نہیں کیا۔برسوں بعد میں نے اس پورے واقعہ کا ذکر حضرت سے کیا تو سن کر بس مسکرادیے۔

مدرسہ کی چیزوں کی فکر

حضرتؒ کو مدرسہ کی کسی چیز کی بربادی سے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔تعمیرات سے متعلق سامان کی خود

حفاظت فرماتے اس کو ضائع ہونے سے بچاتے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی نگہداشت کرتے تھے اور اس بارے میں اپنی عنداللہ مسئولیت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

مدرسہ کی مسجد کا درمیانی حصہ اصلی قدیم حصہ ہے، مغربی اور مشرقی حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ جب یہ نیا حصہ تعمیر ہو گیا اور اس کا فرش بھی ذرا خوبصورت اور اچھا بن گیا تو پرانے حصہ کا فرش جو کسی وجہ سے کچھ بیٹھ گیا تھا، اور نئے کے مقابلہ میں کچھ اچھا بھی نہ تھا، کچھ بے جوڑ سا لگنے لگا۔ ایک دن اُن اساتذہ کے سامنے جو تعمیرات میں دخل بھی رکھتے تھے، یہ فرمایا کہ یہ فرش بھی اگر نئے فرش کی طرح ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا، بس اتنی سی بات پر ان حضرات نے حضرتؒ کی عدم موجودگی میں نیا فرش بنانے کے لئے اس پرانے فرش کو توڑنا شروع کر دیا۔ ابھی تھوڑا سا حصہ ہی توڑا تھا کہ مولانا سفر سے واپس تشریف لے آئے، اس صورت حال کو دیکھ کر بہت غمگین ہوئے، میں اس وقت ندوہ آ چکا تھا، لیکن حاضری ہوتی رہتی تھی۔ اتفاق سے انہیں دنوں میں ہتھورا حاضر ہوا تھا، حضرت مسجد میں تشریف فرما تھے اور اس کوشش میں تھے کہ فرش کے ٹکڑے بڑے بڑے نکل آئیں جنہیں اور کسی جگہ بطور فرش استعمال کر لیا جائے۔ جب مزدور اس کو توڑ رہے تھے تو مجھ سے فرمایا مزدوروں کے ہتھوڑوں کی ایک ایک ضرب میرے دل پر لگ رہی ہے۔ اور پورا قصہ جو میں نے لکھا حضرت نے سنایا۔ یہ بھی فرمایا کہ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ فرش توڑ دیا جائے۔

طلبہ کے ساتھ حسن سلوک

ضلع پرتاب گڈھ کے ایک طالب علم احمد اللہ نامی مدرسہ میں پڑھتے تھے، انہوں نے حضرت کی شفقت کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ وہ بیمار تھے، حضرت بغرض علاج ان کو باندہ لے گئے۔ باندہ میں حضرت کا قیام ایک چھوٹی سی مسجد میں ہوا کرتا تھا، جس میں مؤذن یا امام کے لئے ایک بہت ہی چھوٹا

سا کمرہ تھا۔اس کمرہ میں صرف ایک آدمی کے لیٹنے کی گنجائش تھی۔ میں بھی حضرت کے ساتھ اس کمرہ اور مسجد میں کئی بار قیام کر چکا ہوں۔ان طالب علم نے سنایا کہ حضرت نے مجھے تو اس کمرہ میں امام صاحب کی چار پائی پر لٹایا، اور خود مسجد میں زمین پر لیٹ گئے۔اور اپنے ہاتھ میں ایک رسی باندھ کر اس کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں دے دیا کہ اگر رات میں تمہیں کچھ ضرورت پیش آئے تو مجھے جگانے کے لئے اس رسی کو حرکت دے دینا۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ایسی شفقت ومحبت کے معاملات حضرت کے یہاں نادر اور اتفاقی نہ تھے، بالکل عام طلبہ کے ساتھ بھی ان کا طرز عمل اسی طرح کا رہتا تھا۔

دین کی خاطر پتھر کھانا

مولانا کو دین کی خاطر پتھر کھانے کی سعادت اور انبیاء علیہم السلام کی سنت سے بھی واسطہ پڑتا رہتا تھا، ضلع فتح پور کا ایک قصبہ للوی متشدد قسم کے بریلوی حضرات کا گڑھ تھا، وہاں چند ہی لوگ صحیح الخیال تھے، مولانا ان کے یہاں آمد ورفت کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے، تاکہ دوسرے حضرات کو بھی دین پہنچا سکیں، لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اس قصبہ کے کچھ لوگ کلکتہ اور بمبئی وغیرہ میں بسلسلۂ روزگار رہتے تھے۔ وہاں ان لوگوں میں شدت نہ تھی پھر وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ بمبئی اور کلکتہ کے بڑے بڑے رؤساء مولانا کا اکرام کرتے ہیں۔اس لئے بھی ان لوگوں میں کچھ قریب آنے کی گنجائش تھی۔ایک مرتبہ حضرت کلکتہ تشریف لے گئے تھے، اسی قصبہ کے ایک صاحب کو مولانا کی آمد کا علم ہوا وہ اپنے وطنی رشتہ سے مولانا سے ملاقات کرنے آئے۔اللہ تعالیٰ نے مولانا کو لوگوں کے دلوں کو جیت لینے کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ان کا آنا تھا کہ حضرت نے ان کا غیر معمولی اکرام اور خیر مقدم کیا اور کلکتہ کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کا تعارف کرایا، کہ یہ ہمارے وطن کے بالکل قریب کے رہنے والے ہیں،

اوران کے قصبہ کے بالکل قریب ہی ہمارے اعزہ کے گاؤں بھی ہیں اوراُن لوگوں کا اِن کے قصبہ اور اہل قصبہ سے بڑا تعلق ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کھانے میں بھی ساتھ بٹھایا، بس وہ صاحب تو دل دے بیٹھے، اور جب کسی وقت اپنے وطن آئے تو حضرت کو بلا کر کرا پنے گھر کے سامنے تقریر کرائی۔ قصبہ کے لوگوں نے پہلے تو کچھ زیادہ مخالفت نہ کی لیکن رات میں اسٹیج پر خوب پتھر برسائے، حضرت کے بھی لگے، لیکن یہی تو موقع تھا، لوہا گرم تھا، حضرت نے دل نکال کرر کھ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع پر پوری تقریر ہوئی۔ بہت سے پتھر دل لوگوں کے دل نرم ہوئے اور آئندہ کے لئے راستہ کھل گیا۔ اوراب الحمدللہ وہاں اپنے لوگوں کا ایک مدرسہ ہے اور الحمدللہ دینی کام بھی ہورہا ہے۔

ہم لوگوں کے ایک شاگرد جن کو حضرت سے بہت زیادہ عقیدت تھی، اپنا نکاح پڑھوانے کے لئے مولانا کو لے گئے۔ اس گاؤں کے لوگ سخت قسم کے بریلوی تھے، مجلس نکاح ہی میں پتھروں سے خوب تواضع کی۔ کسی طرح مختصر بات کر کے نکاح پڑھایا اور تشریف لے آئے۔ وہ شاگرد بھی بیچارے بہت ہی نادم ہوئے، ان کا ارادہ تو کچھ اور ہی تھا لیکن حضرت نے ان کو سمجھا بجھا کر استقامت کی تلقین فرمائی۔

اس بندۂ خدا کو اللہ کے راستہ میں نہ جانے کتنی بار پتھروں کی مار کھانی پڑی تھی۔ مگر اِس واقعہ کا ذکر حضرت نے کبھی نہیں کیا، اُن مولوی صاحب نے خود مجھے سنایا تھا۔

مدرسہ کا جنوبی دروازہ گاؤں کی طرف کھلتا ہے، اس زمانہ میں گاؤں والوں کے جانور، گائے، بھینس، بکری، مرغی سب ہی مدرسہ میں آتے جاتے تھے، کچھ اساتذہ بھی بکریاں اور مرغیاں پالتے تھے، جن کی وجہ سے مدرسہ کے صحن میں برآمدوں میں اور چبوتروں پر گندگی ہوجاتی تھی، اپنے کمرے کے سامنے کی مینگنیاں وغیرہ خود ہی حضرت جھاڑو سے صاف کرلیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی دروازے کے سامنے مدرسہ کے صحن میں کوئی گائے یا بھینس گوبر کرگئی۔ حضرت نے دیکھا زیرلب کچھ ناگواری کا اظہار کیا، اور دونوں آستینیں چڑھا کر اپنے ہاتھ سے اٹھانے کے لئے چلے۔ میں ساتھ تھا، میں نے جلد آگے

بڑھ کر اپنے ہاتھ سے اسے اٹھالیا۔ حضرت فرماتے رہ گئے: ارے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ارے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں'' اور میرے ہاتھ سے اُسے اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ میں نے عرض کیا: حضرت میرے ہاتھ تو گندے ہو ہی گئے، آپ کیوں اپنے ہاتھ گندے کرتے ہیں؟ میں نے وہ گوبر مدرسہ کے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ جس گوبر کو خود اپنے ہاتھ سے اٹھانے جا رہے تھے، میرے اٹھا لینے پر بہت تکلیف ہوئی، اور طلبہ پر برس ہی تو پڑے: تم لوگوں کو کیسے علم آئے گا؟ حدیث وتفسیر کے استاد سے گوبر اٹھواتے ہو؟ تمہاری آنکھیں کہاں چلی گئی تھیں؟ تم نے کیوں نہیں دیکھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

مولانا کے یہاں کثرت اسفار کے باوجود درس کی پابندی کا لحاظ بہت ہوتا تھا۔ اس کے لئے مولانا سفر سے جلد از جلد واپس آنا چاہتے تھے۔ تاکہ مدرسہ پہنچ کر اسباق پڑھا دیں۔ اور اس کی خاطر سفر میں ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے تھے۔ سبق کی پابندی کے لیے صعوبتیں برداشت کرنے کے واقعات تو دن رات ہوتے رہتے تھے۔ یہاں دو واقعے پڑھ لیجئے۔

ایک بار فتح پور ضلع میں عالم گنج نام کے ایک گاؤں میں تقریر کرنے کے لئے گئے۔ تقریر سے فارغ ہو کر رات کو ایک دو بجے کے قریب وہاں کے لوگوں سے فرمایا کہ ہمیں کوئی صاحب موٹر سائیکل سے جمنا کے کنارے تک پہنچا دیں (وہاں پر عارضی پل بنا ہوا تھا) ہم کسی ٹرک سے باندہ چلے جائیں گے، اور صبح لڑکوں کو پڑھا لیں گے۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور مولانا نے جمنا کے کنارے جہاں بالکل آبادی نہیں ہے، ٹرک کے انتظار میں تنہا ساری رات گزار دی۔ رات کو ٹرک نہیں ملا، صبح کو ملا۔ مدرسہ آ کر مجھ سے بہت ہی افسوس کے ساتھ فرمانے لگے کہ ساری رات جمنا کے بالو پر پڑا رہا، نہ سویا، نہ کوئی سواری ملی، نیند بھی گئی اور اسباق کا ناغہ بھی ہوا۔

ایسے ہی کسی سفر سے واپس آ کر رات کو باندہ شہر کی عیدگاہ میں لیٹ گئے، کہ اُدھر سے رات میں ٹرک گذرتے ہیں، کسی ٹرک سے نو میل تک چلے جائیں گے اور صبح فجر سے پہلے یا فجر بعد سبق پڑھا لیں

گے۔لیکن اس بار بھی کوئی سواری نہ مل سکی۔ مدرسہ آ کر فرمانے لگے کہ ساری رات عیدگاہ میں مچھروں سے کٹواتے رہے لیکن کوئی سواری نہ مل سکی اور اسباق کا ناغہ بھی ہو گیا۔

عجیب اُسوہ

حضرت کی پوری زندگی خادمان دین کے لیے خاص طور سے اعلیٰ اسوہ اور نمونہ تھی۔ اخلاص وللّٰہیت، تعلق مع اللہ، یقین وتوکل، تواضع وفنا اور استغنا کے علاوہ ان کو اللہ تعالیٰ نے عجب حکمت دی تھی۔ لکھنؤ کے ایک بڑے تاجر حاجی ....صاحب حضرت کے غیر معمولی مخلص ومعتقد تھے، حضرت خود حاجی صاحب کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور کبھی قیام بھی فرماتے تھے۔ وہ حضرت کے لیے اپنی گاڑی بھی پیش کرتے تھے اور حضرت دینی کاموں میں استعمال بھی فرماتے تھے۔ایک مرتبہ حضرت لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔حاجی صاحب کے یہاں ہی رات قیام فرمایا تھا۔ واپسی میں رائے بریلی سے بڑی صاحب زادی اور ان کے بچوں کو لیتے ہوئے ہتھورا جانا تھا۔ یہ فجر کا وقت تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت پہلے بس سے رائے بریلی جائیں گے، وہاں سے ان لوگوں کو لے کر بس سے ہی باندہ جائیں گے، وہاں سے تیسری بس سے نومیل تک، اور اسکے آگے کے لیے یا تو پیدل یا گاؤں سے کسی سواری کو منگائیں گے۔ حاجی صاحب نے اپنی گاڑی پیش کی۔ حضرت نے معذرت کی۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ گویا رائے بریلی سے آگے پورے سفر لو کے تھپیڑوں سے واسطہ رہنا تھا۔اس لیے حاجی صاحب کا اصرار تھا کہ واپسی ان کی کار ہی سے ہو۔مگر حضرت کسی طرح قبول نہیں کر رہے تھے۔ میں نے تنہائی میں عرض کیا: آپ کیوں کار نہیں لے جاتے؟ کیا حاجی صاحب کی پیش کش کے مخلصانہ ہونے میں شک ہے؟ فرمایا: نہیں، میں دینی کاموں کے لیے ان لوگوں کی گاڑیاں استعمال کر لیتا ہوں۔مگر اگر اپنے ذاتی استعمال کے لیے گاڑی لینے لگا تو گاڑی والے دیکھ کر منہہ چرانے لگیں گے۔ میں سوچتا رہ گیا کہ ان کی

نظر کہاں تک رہتی ہے۔ اور پھر بس سے ہی تشریف لے گئے۔

کشف وکرامات کوئی زیادہ کمال کی چیزیں نہیں ہیں

اللہ جانے لوگوں نے حضرت کی کیا کیا کرامات گڑھ رکھی ہیں۔ ہم لوگوں نے تو اس بندۂ خدا کی مجاہدانہ زندگی، اتباع سنت اور بے مثال اخلاص وایثار کے سوا کوئی معروف قسم کی کرامت نہیں دیکھی، بلکہ بعض سنی سنائی کرامتوں کی حضرت سے تصدیق کی تو حضرت نے نفی ہی فرمائی۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے ایک دن فرمانے لگے: یہ کشف وکرامات کوئی مشکل کام نہیں، ذرا سی ریاضت اور لوگوں سے اجتناب اور عزلت نشینی سے یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں، اور فرمایا: جس زمانہ میں، میں پانی پت میں پڑھتا تھا تو اکثر اوقات اپنے کمرے میں گزارتا اور لوگوں کے اختلاط سے بہت پرہیز کرتا تھا، اس وقت مجھے بہت صحیح کشف ہونے لگا تھا اور اپنے کشف کا ایک واقعہ بھی سنایا، فرمایا کہ ایک بہت ہی صحت مند سرحدی نوجوان کے متعلق مجھے یہ کشف ہوا کہ اس کو کل پولیس پکڑ لے جائے گی۔ میں نے اس نوجوان سے تنہائی میں اس کا ذکر کیا، اس نے مجھ سے کہا کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟ میں نے کہا کہ بس اتنا کہ آپ اس مدرسہ کے طالب علم ہیں، تو اس نے اپنا قصہ سنایا کہ میں نے اپنے علاقہ میں انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور جب خطرہ محسوس ہوا تو مخفی طور پر یہاں آکر طالب علمی کر لی ہے، مجھے یہ بتلا کر یہ طالب علم اسی وقت مدرسہ سے غائب ہو گیا، دوسرے دن انگریز پولیس نے پورا مدرسہ گھیر لیا، اور ایک ایک کونہ کی تلاشی لے ڈالی، ان کا افسر بار بار یہی کہتا تھا ہمارے محکمۂ خفیہ کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی، وہ طالب علم کل تک یہیں تھا، اہل مدرسہ نے جو حقیقت حال سے ناواقف تھے پوری سچائی سے بتلا دیا کہ ہاں اس شکل کا طالب علم کل تک تو یہاں تھا مگر اب یہاں نہیں ہے، اور اس سے زیادہ ہمیں کچھ علم نہیں، اپنے کشف کا یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت نے یہ بھی فرمایا مگر اب یہ بات نہیں ہے۔

حضرت کی مزاجی شگفتگی

مزاج میں بڑی شگفتگی تھی، کبھی کبھی اساتذہ وطلبہ سے مزاح بھی فرماتے تھے۔اہل لکھنؤ کی نزاکت پر طنز کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کی ایک عورت اپنے شوہر سے خفا ہوگئی اور کہنے لگی کوئی ایسا بھی تو نہیں جو دو پیسے کی ارہر کی دال لادے اور میں اسے کھا کر خودکشی کرلوں۔اسی طرح لکھنؤ کے ایک بگڑے نواب کا قصہ فرماتے تھے کہ ان کے گھر میں سانپ نکل آیا تو کہنے لگے کہ کوئی مرد بھی تو نہیں کہ سانپ ماردے۔گھر کی ملازمہ نے کہا حضور آپ بھی تو مرد ہیں؟ کہنے لگے ارے ہاں! ہم بھی تو مرد ہیں، یہ قصہ سنا کر حضرت خوب ہنسا کرتے تھے۔جن لوگوں نے حضرت کو اِن آخری آٹھ دس سال ہی میں دیکھا جب اسفار اور کاموں کی تھکن اور فکروں نے حضرت کو بالکل بجھا دیا تھا، وہ حضرت کی اس بے تکلفی اور شگفتگی کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

غیر مسلموں کی نظر میں

دیگر کمالات اور خوبیوں کے علاوہ حضرت کا خاص الخاص وصفِ کمال ان کے وہ کریمانہ اخلاق تھے جو نائبین رسول کا خاصہ ہوا کرتے ہیں۔اس لئے حضرت کی مقبولیت کا دائرہ مسلمانوں سے آگے بڑھ کر غیر مسلموں تک پھیلا ہوا تھا۔غیروں میں ان کی اس مقبولیت کے ایسے نمونے دیکھنے والوں نے دیکھے ہیں کہ ان کی نظیر شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔اسی طرح کے چند واقعات جن میں سے کچھ خود دیکھے ہیں اور کچھ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوئے ہیں، نذر ناظرین کر رہا ہوں، خدا کرے پڑھنے والوں کے لئے مفید ہوں۔

حضرت مولانا کے یہاں پہلی بار ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہونے والا تھا جس کے لئے تیاریاں کافی پہلے سے شروع ہوگئی تھیں۔ مدرسہ کے مشرقی جانب مختلف حضرات کے کھیت تھے جو بہت کچھ ناہموار

تھے۔ان کو ہموار کرنا تھا۔اس کام میں ہتھورا اور قرب وجوار کے دیہات کے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات بھی باقاعدہ لگے ہوئے تھے۔وہ روزانہ صبح کو اپنے گھروں سے آجاتے اور شام تک کام کر کے گھر واپس چلے جاتے۔ یہ کام اور اس کے لئے آمد ورفت کا سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔قرب وجوار کے دیہات میں کے الیہہ ،کلکٹر پوروا اور دوہا کے ہندوؤں نے اس سلسلہ میں ہر طرح کا تعاون کیا تھا۔ یہ لوگ باوجودیکہ اپنے مذہبی معاملات میں خاصے سخت تھے،لیکن حضرت مولاناؒ کی شخصیت سے کافی متاثر تھے۔میں نے ان لوگوں کو بار بار دیکھا کہ اگر سر راہ بھی ان لوگوں میں سے کوئی مل گیا،خواہ عمر میں حضرت سے بڑا ہی کیوں نہ ہوتا،راستہ میں ایک طرف کو کھڑا ہو جاتا،نہایت ادب سے ہاتھ جوڑتا اور کہتا بھیا سلام،حضرت بھی بہت ہی خندہ پیشانی سے اس سے ملاقات کرتے اور ایک دو جملے ملاطفت کے ارشاد فرماتے۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد اگر چہ ہندو مسلم تعلقات ہر جگہ متاثر ہوئے تھے اور فرقہ پرست طاقتوں کو اس سلسلہ میں ہر جگہ کامیابی ہوئی تھی لیکن ہتھورا کے قرب وجوار کے ہندو دیہات میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکے تھے۔الیہہ نام کا گاؤں جو ہتھورا سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور وہاں کی بڑی آبادی ہندو ٹھاکروں کی ہے۔وہاں کے مندر کے پجاری نے باندہ کوتوالی میں جاکر یہ اطلاع دی کہ ہتھورا کے مسلمان ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کررہے ہیں۔دوسرے ہی دن الیہہ میں پی اے سی بھیج دی گئی۔گاؤں کے لوگوں کو پی اے سی کی آمد پر خود تعجب ہوا۔تحقیق کرنے پر یہ پتہ چلا کہ یہ حرکت مندر کے پجاری کی ہے،اوران کی فرمائش پر پی اے سی آئی ہے۔گاؤں کے ہندوؤں نے اول تو ان پجاری صاحب کی خبر لی، پھر پولیس کے ذمہ داروں کو بتایا کہ ہمارے اور ہتھورا کے لوگوں کے تعلقات اس قسم کے ہیں کہ ہمیں ان کی طرف سے اوران کو ہماری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور پھر آپ جانتے ہیں کہ وہاں مولانا صدیق صاحب بھی تو رہتے ہیں۔

اسی گاؤں کے ایک ٹھاکر کو کینسر ہو گیا۔ حضرت کا ان لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ تھا کہ اُس نے حضرت سے مدد کی درخواست کی۔ حضرت بنفس نفیس اس کو علاج کرانے کے لیے بمبئ لے کر گئے۔ اور وہاں علاج کرایا۔

میں نے اپنے اسی رسالہ کے شروع میں ایمرجنسی کا ایک واقعہ لکھا ہے جس میں یہ ذکر کیا ہے کہ باندہ کے کلکٹر اور اس وقت کی کانگریسی حکومت کے ایک وزیر نے مولانا سے نس بندی کے جواز کا فتویٰ لینا چاہا تھا۔ اور اسی سلسلے میں مولانا کی طرف سے کچھ زیادہ ہی سخت لب ولہجہ کا اظہار ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے سبھی لوگوں کو اس کا خطرہ تھا کہ حکومت (جو ایمرجنسی کے زمانے میں بالکل فیلِ مست بنی ہوئی تھی) کی طرف سے بھی مولانا کے ساتھ کسی سخت ردعمل کا معاملہ کیا جائے گا۔ اور شاید آج کی ہی رات میں مولانا کو حراست میں لے لیا جائے گا۔ شہر باندہ میں اس خطرے کے چرچے دن بھر رہے۔ رات کو شہر کے چنیدہ پچاس ہندو جن میں ایک بھی مسلمان نہ تھا کلکٹر صاحب کے پاس گئے، اور ان سے کہا کہ ہم پچاس آدمی صرف ہندو ہیں۔ جن میں ہر سیاسی جماعت کے لوگ شامل ہیں۔ ہم میں کوئی بھی مسلمان نہیں۔ مسلمان آنا چاہتے تھے لیکن ہم ساتھ لے کر نہیں آئے۔ نیز ہندوؤں کی بھی اس سے بڑی تعداد آنے کو تیار تھی۔ ہم لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر آپ مولانا کو گرفتار کرنا چاہیں تو ہم لوگوں کی گرفتاری کا بھی انتظام کر لیں۔ کلکٹر صاحب کا اگر مولانا کو گرفتار کرنے کا ارادہ بھی رہا ہو گا (بعض اطلاعات ایسی ہی تھیں) تو انھوں نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا ہو گا۔

غیر مسلموں کی طرف سے ایمرجنسی کے زمانے میں ایسا اقدام غیر معمولی محبت اور عقیدت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ جن لوگوں کو مولانا کے ساتھ کہیں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کو معلوم ہے کہ مولانا کو مسلمانوں ہی میں نہیں غیر مسلموں میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ اور وہ بھی مولانا کے ساتھ عقیدت ومحبت کے معاملے میں مسلمانوں سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ میں نے بار بار دیکھا کہ مولانا باندہ شہر میں بازار سے

گذر رہے ہیں اور غیر مسلم دوکان دار یا تو دوکان سے باہر آکر یا دوکان کے اندر ہی سے کھڑے ہو کر مولانا کو سلام عرض کر رہے ہیں۔

سچے اخلاق کی تاثیر

لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ مقبولیت اور عقیدت مولانا کے ان اخلاق کریمانہ کا نتیجہ تھی جس میں ظاہر داری کو ذرہ برابر دخل نہ تھا، دین کے داعی کو ایسے ہی اخلاق کریمانہ سے متصف ہونا چاہئے، اسلام کی تعلیمات کا یہی تقاضہ ہے۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے وہ حضرات جو کسی وجہ سے بھی مولانا سے واقف ہو جاتے تھے، اپنے مکتب فکر اور مسلک پر قائم رہتے ہوئے مولانا کے ساتھ حسن اعتقاد کا معاملہ رکھتے۔ اور مسلکی اختلاف کے باوجود مولانا کے حسن اخلاق کے معترف ہوتے تھے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ پڑھ لیجئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن اخلاق کی تاثیر کتنی قوی ہوتی ہے۔

باندہ شہر میں ایک مدرسہ بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کا ہے، وہ لوگ نسباً ایک بڑے بزرگ سے تعلق رکھتے ہیں، اور طبعاً شریف ہیں اور مسلک میں بھی بظاہر زیادہ شدت نہیں ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے کوئی بھی واقفیت براہ راست اس سلسلے میں نہیں ہے۔ اس مدرسہ کا جلسہ ہو رہا تھا، باہر کے ایک شعلہ بیان مقرر (جن کا کام ہی شعلہ بیانی اور آگ لگانا ہے) تقریر کر رہے تھے۔ اثناء تقریر حضرتؒ کے بارے میں کچھ نامناسب بات کہنے لگے، فوراً ہی سامعین میں سے ایک صاحب اٹھے اور بولے: مولانا! میں اس مدرسہ کی کمیٹی کا ممبر ہوں، ہم لوگوں نے آپ کو سیرت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تقریر کرنے کے لئے بلایا ہے۔ مولانا صدیق صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے نہیں۔ ہم ان کو آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ صاحب بیٹھ گئے اور مقرر کو اپنا رخ بدلنا پڑا۔

اللہ نے مولانا کو اپنوں اور غیروں میں جو محبت اور مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ یہ ان کے ایمان کامل اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ تھی اور ایسا ہوتا ہی ہے۔ جو بھی صاحب ایمان بندہ اللہ کا مطیع وفرماں بردار ہوتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال ہی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد فرماتے ہیں:

إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا

یعنی اہل ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا محبوب بنا دیتا ہے۔

اس رسالے کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ اس اسوے کو اپنے سامنے رکھیں۔ حضرت مولانا سید صدیق احمد باندویؒ کی شخصیت ہمارے قریبی زمانے کی شخصیت تھی۔ اس معیار کے کمالات اس زمانے میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سبق حاصل کرنے اور اتباع کی توفیق نصیب فرمائے۔